www.alrisala.org

الرسالہ

Al-Risala

June 2013 • No. 439 • Rs. 15

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جون 2013

فہرست

حامل کتاب قوم	2
موت کی یاد کا مثبت پہلو	3
دین کے بدلے دنیا	4
انقلابی اسپرٹ	5
سچائی کی سیٹ	7
قانونِ فطرت کو جانیے	9
اللہ کے دشمن	11
انگریزی تعلیم	12
ربوبیت: کائنات میں ربانی تنظیم	14
سادہ فارمولا	22
پیرانویا کی نفسیات	23
اسلام اور مسلمان	26
اسلام کے نام پر سیاست	36
قبولِ اسلام کا ایک واقعہ	37
افراد سازی کی اہمیت	38
عبرت یا عذاب	39
ناعاقبت اندیشانہ اقدام	40
صلاحیت کی قدردانی	41
اقدام کی شرط	42
سب سے بڑی قربانی	43
الرسالہ مشن	44
سوال و جواب	45

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Mob. 8588822679, 8588822680
Tel. 011-46521511, 41827083,
Fax: 011-45651771
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy ₹15
One year ₹150
Two years ₹ 300
Three years ₹ 450

By Registered Mail:
One year ₹400
Two years ₹ 800
Three years ₹1200
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

حاملِ کتاب قوم

قرآن میں قدیم اہلِ کتاب (یہود) کے حوالے سے فطرت کے ایک قانون کو بتایا گیا ہے۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں: مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (62:5) یعنی جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا، پھر انھوں نے اس کو نہیں اٹھایا، اُن کی مثال اُس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔

یہ تمثیل صرف سابق اہلِ کتاب (یہود) کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ وہ ماضی کے تجربے کی صورت میں حال کے اہلِ کتاب (امتِ مسلمہ) کے بارے میں بھی ہے۔ قرآن میں یہ مثال اِس لیے دی گئی ہے، تاکہ امتِ مسلمہ کے لوگ اُس سے سبق لیں اور اپنے آپ کو اس کے برے انجام سے بچائیں۔

قرآن کی اِس آیت میں دراصل امت کے دو دور بتائے گئے ہیں — زوال سے پہلے کی حالت، اور زوال کے بعد کی حالت۔ اَلَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ سے مراد زوال سے پہلے کی حالت ہے، یعنی وہ ابتدائی حالت جب کہ امت کے اندر دین زندہ ہوتا ہے، وہ مطلوب انداز میں دین پر قائم ہوتی ہے۔ یہ وہ ابتدائی دور ہے جس کو حدیث میں قرونِ ثلاثہ کہا گیا ہے۔

حدیث کے مطابق، امت کی یہ حالت ابتدائی تین نسلوں تک ہوتی ہے۔ اِس کے بعد قانونِ فطرت کے مطابق، امت پر زوال آجاتا ہے۔ اِس بعد کے دور کو كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

اس زوال یافتہ دور میں امت بظاہر کتاب کی حامل بنی ہوئی ہوتی ہے، لیکن اب کتاب کی اصل روح اس کے اندر باقی نہیں ہوتی۔ اب اس کا معاملہ ایسے حیوان جیسا ہوجاتا ہے جس کی پیٹھ پر بظاہر کتابیں لدی ہوئی ہوں، لیکن یہ کتابیں اس کے شعور کا حصہ نہ ہوں — پہلے دور میں امت انسان کی سطح پر حاملِ کتاب ہوتی ہے اور دوسرے دور میں حیوان کی سطح پر حاملِ کتاب۔

موت کی یاد کا مثبت پہلو

ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أكثروا ذكر هادم اللذات، الموت (الترمذي، رقم الحديث: 2307) یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کرو جو لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے۔

اِس حدیث میں 'ہادم' (ڈھا دینے والا) کا لفظ سلبی معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ ایجابی معنی میں ہے، یعنی موت کی یاد صرف موت کی یاد نہیں، بلکہ اس کا ایک بہت بڑا مثبت پہلو ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ موت اِس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ دنیا کی تمام لذتیں مٹ جانے والی ہیں، اِس لیے تم دنیا کی لذتوں کے بجائے، آخرت کی لذتوں کو اپنی سوچ کا مرکز بناؤ، کیوں کہ آخرت کی لذتیں ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں (فاٰثروا ما یبقی علی ما یفنی)۔

انسان ایک لذت پسند مخلوق ہے۔ انسان ہر دور میں اپنی لذتوں کی تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ قدیم زمانے میں لذت کے سامان بہت محدود تھے۔ موجودہ زمانے میں لذت کے سامانوں کی کثرت ہوگئی ہے۔ اِس اعتبار سے، موجودہ زمانے کو کنزیومرازم (consumerism) کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں کنزیومرازم کا دور آیا تو انسان مزید اضافہ کے ساتھ اپنی لذتوں کی تسکین حاصل کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔

مگر تاریخ کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اِس معاملے میں انسان کا کیس کامل محرومی کا کیس ہے، انسان نہ قدیم روایتی زمانے میں تسکین کا سامان حاصل کرسکا، اور نہ جدید کنزیومرازم کے زمانے میں۔ گویا اِس دنیا میں طالب موجود ہے، مگر یہاں اس کا مطلوب موجود نہیں۔ جس آدمی کا شعور زندہ ہو، اس کے لیے موت اس بات کی یاد دہانی بن جائے گی کہ جس مطلوب کو میں قبل از موت دور میں نہ پاسکا، وہ مطلوب خالق کے پلان کے مطابق، موت کے بعد کے دور میں رکھ دیا گیا ہے۔ ایسے آدمی کے لیے موت کا تصور اس کی زندگی کے کورس کو متعین کرنے والا بن جائے گا۔

دین کے بدلے دنیا

قرآن میں یہود کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا (2:41) یعنی تم اللہ کی آیتوں کے بدلے ثمنِ قلیل مت خریدو۔ اِس آیت میں 'ثمنِ قلیل' سے مراد دنیا کے فائدے ہیں۔ اِس کا مطلب ہے اللہ کے کلام کو دنیا کے مادّی فائدے کے لیے استعمال کرنا۔ یہود نے اپنے دور زوال میں یہ کیا تھا کہ وہ اللہ کے کلام کو دنیوی فائدوں کے حصول کے لیے استعمال کرنے لگے۔ حدیث میں پیشین گوئی کی گئی تھی کہ مسلمان اپنے دورِ زوال میں یہود کا اتباع کریں گے (لتتبعنّ سنن من كان قبلكم شبراً بشبر و ذراعاً بذراع)۔ یہود کا یہ اتباع موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر دیکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً آپ مسلمانوں کی کسی بک مارکیٹ میں جائیے۔ وہاں آپ کو کثرت سے ایسی کتابیں ملیں گی جن میں ایسے وظائف اور عملیات بتائے گئے ہوں گے جن کے متعلق اُس میں یہ بشارت درج ہوگی کہ اس پر عمل کرنے سے آپ کو ہر قسم کے دنیوی فوائد حاصل ہوجائیں گے۔

مثلاً اس میں جامع تعویذ کا ایک نسخہ اِن الفاظ میں لکھا ہوا ہوگا: بسم اللہ کا تعویذ ہر طرح کے بخار نیز تنگ دستی اور قرض وغیرہ جیسی ہر قسم کی پریشانی کے لیے مفید ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھ کر گلے یا دائیں ہاتھ کے بازو میں باندھنا یا ٹوپی میں رکھ کر پہننا چاہیے۔ اِسی طرح اس میں ایک عمل اِن الفاظ میں درج ہوگا کہ قرآن کی آیت: "نرفع درجات من نشاء وفوق كلّ ذي علم عليم" کو تین روز تک روزانہ سات ہزار مرتبہ پڑھے۔ اس کے بعد ملازمت کے لیے درخواست دے تو اس کی درخواست ضرور منظور ہوگی۔ اِسی طرح اس میں لکھا ہوگا کہ یا حي یا قیوم ایک ہزار بار اور یا وھّاب ایک ہزار بار پڑھے۔ اِس سے مرتبہ بڑھے گا اور مال میں بہت زیادہ اضافہ ہوگا، وغیرہ۔

یہی وہ روش ہے جس میں یہود اپنے دور زوال میں مبتلا ہوئے اور قرآن میں یہود کی اِس روش کی مذمت کی گئی۔ موجودہ زمانے کے مسلمان اپنے دور زوال میں ہیں۔ وہ بھی ٹھیک اُسی روش میں مبتلا ہو چکے ہیں جس میں یہود اپنے دورِ زوال میں مبتلا ہوئے تھے۔

انقلابی اسپرٹ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات 632 عیسوی میں ہوئی۔ اس کے بعد پورے عرب میں سنگین صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ اِس کا اندازہ حضرت عائشہ کی حسب ذیل روایت سے ہوتا ہے: ولما توفي رسول الله صلي الله عليه وسلم ارتدت العرب، واشرأبّت اليهودية والنصرانية ونجم النفاق، وصار المسلمون كالغنم المطيرة في الليلة الشاتية لفقد نبيهم، حتى جمعهم الله على أبي بكر (البداية والنهاية 5/279) یعنی جب رسول اللہ کی وفات ہوئی تو عرب میں ارتداد پھیل گیا۔ یہودیت اور نصرانیت نے سر اٹھایا اور نفاق ظاہر ہوگیا۔ اور پیغمبر کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان جاڑے کی رات میں بھیگی ہوئی بکری کے مانند ہوگئے، یہاں تک کہ اللہ نے مسلمانوں کو ابوبکر پر جمع کر دیا۔

اِس نازک موقع پر حضرت ابوبکر نے جو کام انجام دیا تھا، اس کی تفصیل کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں ہم اِس سلسلے کی صرف ایک روایت نقل کرتے ہیں۔ جب مذکورہ صورتِ حال پیش آئی، اُس وقت اپنے عزم کا اظہار کرتے ہوئے حضرت ابوبکر کی زبان سے یہ الفاظ نکلے تھے: أينقص الدين وأنا حيّ (هداية الرواة لابن حجر العسقلاني، رقم الحديث: 3031) یعنی کیا دین میں نقص پیدا کیا جائے گا اور میں زندہ ہوں۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق کے اِس قول سے زندگی کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے — کوئی بڑا کام ہمیشہ اُس وقت ہوتا ہے جب کہ ایک شخص کے اندر یہ عزم پیدا ہوجائے کہ یہ میری ذمے داری ہے اور میں اِس کام کو کروں گا۔ بڑا کام ہمیشہ ایک باعزم انسان کے ذریعے انجام پاتا ہے، نہ کہ کسی بھیڑ (crowd) کے ذریعے۔ اِس قسم کی طوفانی اسپرٹ ایک فرد کے اندر پیدا ہوتی ہے، نہ کہ کسی مجموعے کے اندر۔ یہ ایک کوہ شکن اسپرٹ ہے۔ اِس کو ایک لفظ میں — ''آئی ول ڈو اسپرٹ'' (I will do spirit) کے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

اس معاملے میں دوسری صورت یہ تھی کہ حضرت ابوبکر یہ سوچتے کہ اِس وقت ملک میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ اصحابِ رسول موجود ہیں، یعنی وہ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان لائے،

جنھوں نے رسول اللہ کو دیکھا، جنھوں نے رسول اللہ کی صحبت پائی۔ یہ سوچ کر حضرت ابوبکر کہتے کہ: أینقص الدین و أصحاب الرسول أحیاء (کیا دین میں نقص پیدا کیا جائے گا، حالاں کہ اصحابِ رسول زندہ ہیں)۔ اِس کے بجائے حضرت ابوبکر نے کہا کہ: أینقص الدین و أنا حي۔

حضرت ابوبکر اگر پہلا جملہ کہتے تو نفسیاتی طور پر وہ ذمے داری کو پورے مجموعے پر ڈال دیتے۔ ایسی حالت میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اُن کا ذہن یہ کہتا کہ ایک لاکھ پچاس ہزار ذمے داریوں میں سے صرف ایک ذمے داری ان کی اپنی ہے۔ اِس کے برعکس، جب انھوں نے دوسرا جملہ کہا تو ان کا ذہن اِس عزم سے بھر گیا کہ ساری کی ساری ذمے داری تنہا ان کی اپنی ہے، کسی کا انتظار کئے بغیر انھیں خود اپنے آپ کو اِس کام میں پوری طرح جھونک دینا ہے۔

اِس اسپرٹ کو ایک لفظ میں انقلابی اسپرٹ کہا جاسکتا ہے۔ تمام بڑے کام اِسی انقلابی اسپرٹ کے ذریعے انجام پاتے ہیں۔ جہاں افراد کے اندر یہ انقلابی اسپرٹ موجود نہ ہو، وہاں باتیں تو بہت ہوں گی، لیکن ایسی صورت میں کوئی بڑا کام انجام پانے والا ہرگز نہیں۔

کسی فرد کے اندر یہ انقلابی اسپرٹ اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ وہ مسئلے کو اپنا ذاتی مسئلہ بنا لے، جب اس کو یقین ہوجائے کہ یہ کوئی خارجی سوال نہیں، یہ اس کی اپنی زندگی اور موت کا سوال ہے، یہیں اس کے لیے یا تو کامیابی کا فیصلہ ہونے والا ہے یا ناکامی کا فیصلہ۔ جب کوئی فرد اِس طرح ایک مسئلے کو اپنا ذاتی مسئلہ بنالے تو اُس وقت اس کے اندر ایک انقلابی اسپرٹ پیدا ہوجاتی ہے، اور یہی انقلابی اسپرٹ کسی بڑے کام کی اصل ضامن ہے، خواہ وہ کوئی مذہبی کام ہو یا سیکولر کام۔

New **Contact** numbers of
Goodword and **Al-Risala**

For Al-Risala **subscription**, please contact:
8588822679 or 8588822680

For ordering **books**, please contact:
8588822671, 8588822672, 8588822673,
8588822674, 8588822675, 8588822676

سچائی کی سیٹ

قرآن کی سورہ القمر میں اہلِ جنت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں وہ اللہ کے قریب سچائی کی سیٹ پر جگہ پائیں گے: اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ○ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ (54:54-55) یعنی اہلِ تقوی باغوں اور نہروں کے درمیان ہوں گے۔ وہ سچائی کی سیٹ پر ہوں گے، قدرت والے بادشاہ کے پاس:

The God-conscious will find themselves in gardens and rivers. In the seat of truth with an all-powerful sovereign.

اہلِ جنت کی سب سے بڑی سعادت یہ ہوگی کہ آخرت کی دنیا میں وہ اللہ کی قربت میں جگہ پائیں۔ اللہ کی قربت بلاشبہہ انسانی سعادت کا سب سے اعلیٰ مقام ہے۔ سچے اہل ایمان کو اِس دنیا میں قربت کا یہ درجہ بہ اعتبار احساس ملتا ہے، اور آخرت میں سچے اہلِ ایمان کو یہ درجہ بہ اعتبارِ حقیقت حاصل ہوگا۔

سچ بولنا انسان کی سب سے بڑی خوبی ہے اور جھوٹ بولنا انسان کی سب سے بڑی برائی۔ سچ بولنا یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کہے، وہ حقیقتِ واقعہ کے عین مطابقت ہو، اور جھوٹ بولنا یہ ہے کہ آدمی ایسی بات کہے جو حقیقتِ واقعہ سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔

ایسے لوگ بہت کم ہیں جو دانستہ طور پر کھلا کھلا جھوٹ بولتے ہیں، لیکن جھوٹ کی ایک اور قسم ہے جس میں تقریباً سارے لوگ مبتلا رہتے ہیں، اور وہ ہے جذباتی تاثر کے تحت خلافِ واقعہ بات کہنا۔ اِس دوسرے جھوٹ کی سب سے زیادہ عام قسم وہ ہے جو قومی معاملات میں پیش آتی ہے، یعنی اپنی قوم اور دوسری قوم کے درمیان پائی جانے والی شکایت کے بارے میں خلافِ واقعہ بیان دینا۔ اِس طرح کے قومی معاملے میں تقریباً ہر آدمی یہ کرتا ہے کہ وہ متاثر ذہن کے تحت بولتا ہے۔ وہ دوسری قوم کی غلطی کو بتاتا ہے، لیکن وہ خود اپنی قوم کی غلطی کا ذکر نہیں کرتا۔ وہ قومی نزاعات کی تصویر اِس طرح پیش کرتا ہے، جس میں دوسری قوم سراسر ظالم اور اپنی قوم سراسر مظلوم دکھائی دے۔ قومی نزاعات کی اِس طرح

رپورٹنگ یقینی طور پر ایک جھوٹ ہے، وہ یقینی طور پر قانون فطرت کے خلاف ہے۔ قومی معاملات میں جھوٹ کی روش اختیار کرنے والے لوگ بظاہر قوم کی ہمدردی کے جذبے کے تحت ایسا کرتے ہیں، مگر اپنے انجام کے اعتبار سے، بلاشبہہ یہ قوم کے ساتھ دشمنی ہے، نہ کہ قوم کے ساتھ ہمدردی۔

قرآن میں اہلِ ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (5:8) یعنی کسی گروہ کی دشمنی تم کو اِس پر نہ ابھارے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو، یہی تقوی سے زیادہ قریب ہے:

Believers, do not let your enmity for others turn you away from justice. Deal justly; that is nearer to being God-fearing.

کوئی آدمی جھوٹ پر کھڑا ہوا ہے یا وہ سچائی پر کھڑا ہوا ہے، اِس کا صحیح اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب کہ کسی سے اس کو شکایت یا نزاع پیدا ہو جائے۔ شکایت پیدا ہوتے ہی آدمی فوراً غیر منصفانہ بولی بولنے لگتا ہے۔ اِسی غیر منصفانہ کلام کو قرآن میں تطفیف (83:1) کہا گیا ہے، یعنی دوسری سائڈ کی غلطی کو بتانا اور اپنی سائڈ کی غلطی کو حذف کر دینا۔ یہ طرز کلام ایک غیر معقیانہ طرز کلام ہے، اور جو لوگ غیر معقیانہ روش میں مبتلا ہوں، وہ کبھی اللہ کے پڑوس میں جگہ نہیں پا سکتے۔

دوسری قوم کو ظالم بتانا اور اپنی قوم کو مظلوم بتانا دنیا میں قومی مقبولیت کے لیے بہت مفید ہے۔ قوم پسند بولی بولنے والے لوگ بہت جلد اپنی قوم میں قیادت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں، مگر آخرت کے اعتبار سے، یہ صرف ہلاکت ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ قوم پسند بولی بولنے والے لوگ بہت جلد قوم کے اسٹیج پر ممتاز مقام حاصل کر لیتے ہیں، لیکن آخرت کے ربانی اسٹیج پر یقیناً اُن کو کوئی جگہ ملنے والی نہیں۔

قومی شکایت کا موقع آدمی کے لیے سب سے زیادہ امتحان کا موقع ہوتا ہے۔ ایسا ہر لمحہ آدمی کی جنت یا جہنم کا فیصلہ کرنے والا ثابت ہوتا ہے۔ قومی معاملے میں لکھتے اور بولتے وقت جو لوگ غیر منصفانہ رپورٹنگ کریں، وہ گویا کہ دنیا میں جھوٹ کی سیٹ پر کھڑے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کو آخرت کی دنیا میں ہرگز سچائی کی سیٹ پر جگہ ملنے والی نہیں۔

قانونِ فطرت کو جانیے

ڈاکٹر راجندر پرشاد (وفات: 1963) آزاد انڈیا کے پہلے صدر تھے، اُن کے زمانے میں گجرات میں سوم ناتھ کا مندر دوبارہ تعمیر ہوا۔ مئی 1951 میں مرکزی وزیر کے ایم منشی نے ڈاکٹر راجندر پرشاد کو دعوت دی کہ وہ سوم ناتھ مندر کی رسمِ تنصیب (installation ceremony) میں شرکت کریں۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اِس تقریب میں شرکت کی اور وہاں اپنے خطاب کے دوران کہا کہ میرے نزدیک، سوم ناتھ مندر کی تعمیر ثانی اُس دن مکمل ہوگی، جب کہ یہاں نہ صرف ایک شان دار عمارت کھڑی ہوگی، بلکہ سوم ناتھ مندر کی شان دار تعمیر انڈیا کی خوش حالی کی علامت بن جائے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ سوم ناتھ مندر اِس بات کی علامت ہے کہ تخریب کے مقابلے میں تعمیر کی طاقت ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔

یہ واقعہ اُس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کے درمیان شدید نااتفاقی کا سبب بن گیا، کیوں کہ نہرو سوم ناتھ مندر کی تعمیر ثانی کو ہندو احیا کی کوشش کے ہم معنی سمجھتے تھے۔ اِس کے برعکس، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مرکزی وزیر کے ایم منشی کا خیال تھا کہ سوم ناتھ مندر کی تعمیر ثانی آزادی کا ایک پھل ہے اور ماضی میں ہندوؤں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا خاتمہ:

In May 1951, Rajendra Prasad, the first President of the Republic of India, invited by K. M. Munshi, performed the installation ceremony for the temple. Rajendra Prasad said in his address: "It is my view that the reconstruction of the Somnath Temple will be complete on that day when not only a magnificent edifice will arise on this foundation, but the mansion of India's prosperity will be really that prosperity of which the ancient temple of Somnath was a symbol". He added: "The Somnath temple signifies that the power of reconstruction is always greater than the power of destruction."

This episode created a serious rift between the then Prime Minister Jawaharlal Nehru, who saw the movement for reconstruction of the temple as an attempt at Hindu revivalism and the President Rajendra Prasad and Union Minister K. M. Munshi, who saw in its reconstruction, the fruits of freedom and the reversal of past injustice done to Hindus. (en.wikipedia.org/wiki/Somnath)

مذکورہ واقعہ 1951 میں پیش آیا۔ اب اِس واقعے پر 60 سال سے زیادہ کی مدت گزر چکی ہے۔ اب ہم اِس پوزیشن میں ہیں کہ جواہر لال نہرو کے اندیشے کا عملی تجزیہ کرسکیں۔ اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو جواہر لال نہرو کا اندیشہ (apprehension) واقعہ نہ بن سکا۔ اِس درمیان ہندو احیائیت (Hindu revivalism) کی تحریکیں اس کے داعیوں کی طرف سے پوری طاقت کے ساتھ چلائی جاتی رہیں، مگر آج عملاً جس چیز کا غلبہ ہے، وہ تمام تر مغربی کلچر ہے، نہ کہ ہندو کلچر، حتی کہ جو ہندو لیڈر ہندو احیائیت کے علم بردار بنے ہوئے تھے، ان کے اپنے بیٹے اور پوتے ہندو کلچر کو چھوڑ کر تیزی کے ساتھ مغربی کلچر کی طرف دوڑ رہے ہیں۔

اِس سلسلے میں دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ دوبارہ کچھ ہندو لیڈروں نے ایک 'رتھ یاترا' نکالی۔ یہ رتھ یاترا سومناتھ سے شروع ہوکر اجودھیا تک پہنچی۔ یہاں انھوں نے ایک بھیڑ اکٹھا کی۔ اِس بھیڑ نے 6 دسمبر 1992 کو اجودھیا کی تاریخی بابری مسجد کو ڈھا دیا۔

یہ احیا پرست لوگ جس وقت بابری مسجد کو ڈھا رہے تھے، اُس وقت یہ نعرہ ان کی زبان پر تھا کہ — اجودھیا تو جھانکی ہے، کاشی، متھرا باقی ہے۔ اِس واقعے کے بعد تمام مسلم رہنما اِس اندیشے میں پڑ گئے کہ اب ہندستان کی تمام مسجدیں ڈھائی جائیں گی۔ اِس معاملے کو لے کر مسلم رہنماؤں نے تقریر اور تحریر کے ذریعے احتجاجی ہنگامے برپا کیے، مگر عملاً کیا ہوا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اجودھیا میں اِس تحریک پر فل اسٹاپ (full stop) لگ گیا، وہ کاما (comma) نہ بن سکا۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ — اِس دنیا میں ہمیشہ حقائق غالب (prevail) ہوتے ہیں، نہ کہ اندیشے۔

اللہ کے دشمن

قرآن کی سورہ حم السجدہ میں اُن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو دعوت الی اللہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ اِس سلسلے میں قرآن کی متعلق آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: ''اور انکار کرنے والوں نے کہا اِس قرآن کو نہ سنو اور اس میں خلل ڈالو، تاکہ تم غالب رہو۔ پس ہم انکار کرنے والوں کو سخت عذاب چکھائیں گے اور اُن کو ان کے عمل کا بدترین بدلہ دیں گے۔ یہ اللہ کے دشمنوں کا بدلہ ہے، یعنی آگ۔ اُن کے لیے اس میں ہمیشگی کا ٹھکانا ہوگا، اِس بات کے بدلے میں کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے''۔ (41:26-28)

''آیتوں کا انکار'' سے مراد دعوت الی اللہ کی صداقت سے انکار ہے۔ ایسے لوگوں کو ''اعداء اللہ'' کہا گیا ہے، یعنی اللہ کے دشمن۔ دعوت کا مشن ایک خدائی مشن ہوتا ہے۔ جو لوگ دعوت الی اللہ کی مخالفت کریں، وہ خدائی مشن کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اِسی بنا پر اُن کو اللہ کا دشمن بتایا گیا ہے۔

دعوت الی اللہ کے کام کو قرآن میں انذار اور تبشیر (4:165) کہا گیا ہے، یعنی آخرت کی پکڑ سے انسان کو آگاہ کرنا اور آخرت کے انعام سے انسان کو باخبر کرنا۔ یہ کام خود اللہ کا مطلوب کام ہے۔ اللہ کو مطلوب ہے کہ تمام انسان موت سے پہلے یہ جان لیں کہ موت کے بعد اُن کے ساتھ اللہ کے یہاں کیا معاملہ ہونے والا ہے۔ یہ کام اگرچہ اللہ کا مطلوب کام ہے، لیکن اِس دنیا میں اس کو انجام دینے والا انسان ہوتا ہے، یعنی پیغمبر اور داعی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ دعوت الی اللہ کا مشن ایک خدائی مشن ہے، اگرچہ بظاہر وہ انسانوں کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے۔

ایسی حالت میں دعوتی مشن کی مخالفت، اللہ کی مخالفت ہے۔ جو لوگ دعوتی مشن کی مخالفت کرتے ہیں، وہ اپنے خیال کے مطابق، انسان کی مخالفت کر رہے ہوتے ہیں، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ اللہ کے کام کی مخالفت کر رہے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کو قرآن میں اللہ کے دشمن (أعداء الله) کہا گیا ہے۔ آخرت میں اُن کے ساتھ اللہ کے دشمن جیسا معاملہ کیا جائے گا، نہ کہ اللہ کے دوست جیسا معاملہ۔

انگریزی تعلیم

ٹی بی میکالے (Thomas Babington Macaulay) ایک انگریز مورخ اور سیاست داں تھا۔ وہ 1800 میں پیدا ہوا، اور 1859 میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ 1835 میں انڈیا آیا۔ اُس وقت کی برٹش حکومت میں اس کو ایک بڑا عہدے دار بنایا گیا۔ اس نے ایک تعلیمی نظریہ وضع کیا جس کو میکال ازم (Macaulayism) کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد تھا ملک میں اینگلی سائزڈ انڈین (anglicised Indians) کا ایک نیا طبقہ پیدا کرنا۔

لارڈ میکالے سے پہلے انڈیا کی آفیشیل زبان فارسی تھی۔ لارڈ میکالے کی کوششوں سے ایسا ہوا کہ 1938 میں انگریزی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ اِس کے بعد ملک کے اسکولوں میں انگریزی زبان ذریعہ تعلیم قرار پائی۔ لارڈ میکالے کا کہنا تھا کہ — اس سے ایک نئی نسل پیدا ہوگی جو کہ پیدائش کے اعتبار سے ہندستانی اور اپنے ذہن کے اعتبار سے انگریز ہوگی:

So that a generation may arise which is Indian in birth and English in thought.

لارڈ میکالے نے جب یہ کہا تو اس کے خلاف سخت ہنگامہ کیا گیا، خاص طور پر مسلم رہنما انگریزی تعلیم کے شدید مخالف ہوگئے، حتی کہ انھوں نے کہا کہ انگریزی تعلیم گاہیں مسلمانوں کے لیے قتل گاہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر یہ سب غیر ضروری اندیشے تھے۔ عملاً جو کچھ ہونے والا تھا، وہ صرف یہ کہ اِن درس گاہوں میں تعلیم پانے کی وجہ سے کٹر پن ختم ہوجائے اور لوگوں کے اندر کھلا پن آجائے۔ اپنے نتیجے کے اعتبار سے دیکھئے تو لارڈ میکالے کا قول ایک لفظی تبدیلی کے ساتھ دراصل یہ تھا:

So that a generation may arise which is Indian in birth and liberal in thought.

چناں چہ تجربہ بتاتا ہے کہ اِن انگریزی اداروں میں تعلیم پائے ہوئے مسلم نوجوانوں میں سے بہت سے ایسے تھے جو بعد کو بہترین مسلمان بنے۔ مسلم جماعتوں اور تنظیموں کو انھیں انگریزی اداروں سے

بہترین افراد حاصل ہوئے، وغیرہ۔ اِس معاملے میں اصل قابلِ لحاظ بات یہ نہیں ہے کہ لارڈ میکالے یا برٹش حکمرانوں نے بطور خود کس نظریے کے تحت انگریزی تعلیم گاہیں بنائیں، بلکہ اصل قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ باعتبار نتیجہ ان کا انجام کیا ہوا، اور یہ کہ یہاں سے کس قسم کے لوگ تعلیم پا کر نکلے۔

انگریزی تعلیم حقیقتاً برٹش تعلیم نہ تھی، بلکہ وہ جدید علم (modern learning) کے حصول کا ذریعہ تھی۔ ماڈرن ایجوکیشن اپنی حیثیت کے اعتبار سے نہ پرو برٹش (pro-British) تھی اور نہ اینٹی مسلم، وہ صرف جدید علوم تک پہنچنے کا ایک ذریعہ تھی۔ ''انگریزی تعلیم'' کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے اندر ذہنی جمود ٹوٹا، ان کے اندر کھلا پن آیا، ان کے اندر متعصّبانہ طرزِ فکر (biased thinking) کا خاتمہ ہوگا، وہ چیزوں کو موضوعی انداز (objective way) میں دیکھنے لگے، ان کے اندر کٹر پن ختم ہوگیا، ان کے اندر چیزوں کو عقل (reason) کے معیار پر جانچنے کا مزاج پیدا ہوگیا، وغیرہ۔

یہ تمام چیزیں عین دینِ حق کے موافق تھیں، کیوں کہ دینِ حق انسانی فطرت کے عین مطابق ہے، وہ عقل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ دینِ حق کے راستے میں اگر کوئی چیز رکاوٹ ہے تو وہ صرف متعصّبانہ طرزِ فکر ہے۔ کسی بھی طریقے سے اگر متعصّبانہ طرزِ فکر کو ختم کر دیا جائے تو دینِ حق اور انسان کے درمیان حائل فکری دیوار اپنے آپ منہدم ہوجائے گی۔ اس کے بعد انسان اِس قابل ہوجائے گا کہ وہ حقیقت کو اس کی بے آمیز صورت میں دیکھ سکے۔ انگریزی تعلیم یا سیکولر تعلیم کے ذریعے یہی واقعہ پیش آیا۔ اِس تعلیم کے ذریعے بہت سے نوجوان اِس قابل ہوگئے کہ وہ حقیقت کو دریافت کر کے اس کو قبول کرلیں۔ موجودہ زمانے میں اِس طرح کی مثالیں ہر مقام پر دیکھی جاسکتی ہیں — قدیم زمانہ قیاسی استدلال کا زمانہ تھا۔ موجودہ زمانہ سائنسی استدلال کا زمانہ ہے۔ آج کے انسان کے مائنڈ کو ایڈریس کرنے کے لیے سائنسی استدلال کی ضرورت ہے۔ انگریزی تعلیم نے اِسی دروازے کو کھولا تھا۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی نئی صورتِ حال پیش آئے تو اگرچہ وہ بظاہر عُسر دکھائی دیتی ہو تب بھی آپ اس کے اندر یُسر تلاش کریں۔ ہر نئی صورتِ حال ہمیشہ نئے مواقع کو لاتی ہے۔ ایسی حالت میں اصل کام صرف یہ ہے کہ مواقع کو دریافت کر کے ان کو اپنے حق میں استعمال کیا جائے۔

ربوبیت: کائنات میں ربانی تنظیم

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ سارے عالم کا رب ہے (1:1)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے کائنات کو پیدا کر کے اس کو چھوڑ نہیں دیا، بلکہ وہ ہر لمحہ کائنات کو مینج کر رہا ہے، مادی کائنات کو بھی اور انسانی تاریخ کو بھی۔ مادی کائنات میں اللہ کا مینج مینٹ (management) کلی معنوں میں ہے، لیکن انسان کو چوں کہ انتخاب کی آزادی (freedom of choice) ملی ہوئی ہے، اِس لیے انسانی زندگی میں اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ انسان کی آزادی کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے، اس کو مینج کر رہا ہے۔

موجودہ دنیا میں ہر انسان اپنا امتحان دے رہا ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر انسان کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو اِس طرح تعمیر کرے کہ وہ آخرت میں جنت میں داخلے کا مستحق قرار پائے جو کہ انسان کی اصل منزل ہے۔ اِس مصلحت کے تحت اللہ موجودہ دنیا کی مسلسل نگرانی کرتا ہے۔ وہ انسانی تاریخ کو اِس طرح مینج کر رہا ہے کہ موجودہ زمین اپنے دارالامتحان (testing ground) ہونے کی حیثیت کو کسی خلل کے بغیر مسلسل طور پر برقرار رکھے۔ اِس کا مقصد زمین پر اجتماعی معنوں میں کوئی صالح نظام قائم کرنا نہیں ہے، بلکہ اِس کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص اپنی انفرادی تعمیر کرنا چاہے، وہ کسی خلل کے بغیر اپنی شخصی تعمیر کرتا رہے۔

اللہ کی اِس سنت کو قرآن میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: وَلَوْلَا دَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلٰكِنَّ اللهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (2:251) یعنی اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض لوگوں سے دفع نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جائے، مگر اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے:

And if God did not check one set of people by means of another, the earth would indeed be full of mischief. But God is full of bounty to all worlds.

انسانی تاریخ کے بارے میں اللہ کا یہ منصوبہ بظاہر کسی اعلان کے بغیر اپنا کام کر رہا ہے۔ قرآن کی سورہ الکہف (18:60-82) میں موسیٰ اور خضر کے جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، وہ اِسی مینج مینٹ کی ایک جزئی مثال ہیں۔ اِس میں جس کردار کو خضر کہا جاتا ہے، وہ دراصل ایک فرشتہ تھا، نہ کہ کوئی انسان۔

دوطرفہ انتظام

اللہ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد ایک طرف یہ کیا کہ پیغمبروں کو بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا جو ساتویں صدی عیسوی میں خاتم النبیین کے ظہور تک جاری رہا۔ یہ پیغمبر اِس لیے آئے تاکہ انسان کو لفظی طور پر یہ بتادیا جائے کہ انسان کے بارے میں اللہ کا تخلیقی منصوبہ کیا ہے، تاکہ جو انسان اِس تخلیقی منصوبے کے مطابق، زندگی گزارنا چاہے، وہ اس کے مطابق اپنی زندگی کی تشکیل کرسکے۔ خاتم النبیین کے ذریعے اللہ کا جو کلام قرآن کی شکل میں آیا، وہ پوری طرح محفوظ ہوگیا، اور پرنٹنگ پریس کے دور میں ہر انسان تک اس کا مستند نسخہ پہنچ گیا۔ اِس لیے اب کسی پیغمبر کے آنے کی ضرورت نہیں۔

اِس خدائی انتظام کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو تاریخ کا ربانی مینج مینٹ (divine-management of history) کہا جاسکتا ہے۔ اِس مینج مینٹ کا خاص حصہ یہ ہے کہ زمین پر کوئی فتنے کی حالت قائم نہ ہونے پائے۔ چناں چہ جب بھی زمین پر فتنے کی کوئی حالت قائم ہوتی ہے تو اللہ ایسے حالات پیدا کرتا ہے جو اس کو ختم کردینے والے ہوں۔ موجودہ زمانے میں اِس قانونِ دفع کی ایک مثال یہ ہے کہ 1917 میں کمیونسٹ ایمپائر قائم ہوا۔ اس نے ایک بڑے رقبے میں خلافِ مذہب قانون بنا کر انسان سے چوائس (choice) کا حق چھین لیا۔ اُس وقت اللہ تعالی نے امریکا کو استعمال کیا اور تقریباً 75 سال کے بعد 1991 میں کمیونسٹ ایمپائر کے تحت قائم شدہ جبری نظام کا خاتمہ ہوگیا۔

امت مسلمہ کا رول

اِس خدائی منصوبے میں امتِ مسلمہ کا رول کیا ہونا چاہئے، اس کو قرآن میں اشارات کی زبان میں بتا دیا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی سورہ الصّف کی ایک آیت یہ ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآىِٕفَةٌ ۚ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ (61:14) یعنی اے ایمان والو، تم اللہ کے مددگار بنو، جیسا کہ عیسی بن مریم نے حواریوں سے کہا: کون اللہ کے واسطے میرا مددگار ہوتا ہے۔ حواریوں نے کہا: ہم

ہیں اللہ کے مددگار۔ پس بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ لوگوں نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی، اُن کے دشمنوں کے مقابلے میں، مدد کی، پس وہ غالب ہو گئے۔

قرآن کی اِس آیت میں ایک بہت اہم بات کہی گئی ہے۔ اِس آیت کا خطاب امتِ مسلمہ سے ہے، لیکن اِس میں امتِ مسیح کے ایک نمونے کو بطور ماڈل پیش کیا گیا ہے اور امتِ مسلمہ سے یہ کہا گیا ہے کہ تم بھی اُسی ماڈل کے مطابق کام کرو جس کے مطابق، امتِ مسیح نے کام کیا یا مستقبل میں کام کریں گے۔ یہ ماڈل آئڈیالوجی یا عقیدہ کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ وہ صرف طریقِ کار (method) کے اعتبار سے ہے۔ اِس اعتبار سے، امتِ مسیح (Christian community) کے یہاں جو ماڈل ملتا ہے، اس کی دو تاریخی مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ بعد کے زمانے میں مسیحی گروہ، تعداد کے اعتبار سے، سب سے بڑا مذہبی گروہ بن جائے گا (صحیح مسلم، کتاب الفتن)۔ ایسا کیوں کر ہوگا، اس کا جواب بھی اِسی مثال پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔

اِس معاملے کی پہلی مثال وہ ہے جو خود حضرت مسیح کے زمانے میں پیش آئی۔ حضرت مسیح کا مقامِ عمل قدیم فلسطین تھا۔ فلسطین میں حضرت مسیح کے ابتدائی پیروؤں پر سخت ظلم کیا گیا، مگر حضرت مسیح کی تعلیم کے مطابق، اُن کے پیروؤں نے اپنے دشمنوں سے کوئی نفرت نہیں کی۔ انھوں نے دشمنوں کے خلاف کوئی جوابی کارروائی نہیں کی، حتی کہ ان کے خلاف کوئی پروپیگنڈہ بھی نہیں کیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ فلسطین سے باہر چلے گئے اور حضرت مسیح کی تعلیم: دشمن سے محبت کرو (love your enemy) کے اصول پر عمل کرتے ہوئے پرامن دعوت (peaceful missionary work) میں مشغول ہو گئے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سینٹ پال کے زیر اثر مسیحی گروہ کے اندر کچھ نظریاتی انحرافات پیدا ہوئے، لیکن جہاں تک پرامن طریقِ کار کا معاملہ ہے، اُس پر وہ بدستور پوری طرح قائم رہے۔ پرامن مشنری سرگرمیوں کے ذریعے مسیحیت مختلف ملکوں میں پھیلتی رہی، یہاں تک کہ رومی شہنشاہ کانسٹینٹین اول (Constantine I) نے 337 میں مسیحی مذہب قبول کر لیا۔ یہ الناس علی دین ملوکھم کا دور تھا۔ چناں چہ جلد ہی ایسا ہوا کہ یورپ کے تقریباً تمام باشندوں نے مسیحی مذہب کو اختیار کر لیا، مسیحی گروہ کو یہ

غیر معمولی کامیابی تمام تر پرامن دعوت کے ذریعے حاصل ہوئی۔

مسیحی گروہ کے ذریعے تاریخ میں اِس سلسلے میں دوسرا ماڈل ساتویں صدی عیسوی میں قائم ہوا۔ ساتویں صدی میں مسلمانوں کو جب عروج ہوا تو انھوں نے رومن ایمپائر کو توڑ دیا اور اِس مسیحی سلطنت کے پورے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ اِس علاقے میں مسیحی عقیدے کے مطابق، مقدس مقامات، شام اور فلسطین، بھی شامل تھے۔ بعد کے زمانے میں یورپ کے مسیحی بادشاہوں کے اندر یہ جذبہ پیدا ہوا کہ وہ اپنے مقدس مقامات کو مسلمانوں سے واپس لے لیں۔ اِس مقصد کے لیے انھوں نے وہ جنگ چھیڑی جو تاریخ میں، صلیبی جنگ (Crusades) کے نام سے مشہور ہے۔ صلیبی جنگ وقفے وقفے سے تقریباً دوسو سال (1095-1291) تک جاری رہی۔ مورخ گبن کے الفاظ میں، اِس جنگ میں یورپ کی مسیحی قوموں کو ذلت آمیز شکست (humiliating defeat) ہوئی۔ مگر تاریخ کا یہ انوکھا معجزہ ہے کہ اِس شکست کے بعد مسیحی قوموں میں منفی ردّعمل (negative reaction) کا جذبہ پیدا نہیں ہوا، بلکہ انھوں نے یہ کیا کہ اپنے جذبے کو پُرامن عمل کی طرف ڈائورٹ (divert) کردیا، یعنی مسلمانوں سے مسلح مقابلہ ختم کرکے علم و تحقیق کے میدان میں اپنی کوششوں کو صرف کرنا۔

ڈائورژن (diversion) کے اِس عمل کو ابتدائی زمانے میں، اسپریچول کروسیڈ (spiritual crusades) کہا گیا تھا۔ بعد کو وہ رفتہ رفتہ سائنٹفک کروسیڈ (scientific crusades) میں تبدیل ہوگیا۔ اِس عمل میں اُس وقت چرچ رکاوٹ بن گیا تو انھوں نے سخت جدوجہد کے بعد چرچ کے اختیارات پر حد بندی قائم کردی، پھر 1929 میں چرچ کو ویٹکن (روم) کے محدود رقبے میں گویا ہاؤس اریسٹ (house arrest) کردیا جس کا کُل رقبہ صرف 109 مربع ایکڑ ہے۔

اِس دور میں یورپ کے جن لوگوں نے سائنٹفک کروسیڈ (scientific crusades) یا سائنسی ریسرچ کے میدان میں کام کیا، وہ تقریباً سب کے سب مسیحی افراد تھے۔ اِس سائنسی عمل میں بریک تھرو (breakthrough) اُس وقت آیا، جب کہ 1609 میں اٹلی کے فلکیاتی عالم گلیلیو (Galileo Galilei) نے ابتدائی دوربین تیار کی اور اس کے ذریعے خلا کا مشاہدہ کیا۔

اس مشاہدے نے سائنس دانوں کے سامنے عمل کا ایک ایسا میدان کھول دیا جو ناقابل قیاس حد تک وسیع تھا۔ اُس وقت یورپی ذہن نے یہ جانا کہ ہم عالمِ صغیر میں جی رہے تھے، جب کہ یہاں عالمِ کبیر ہمارا استقبال کرنے کے لیے موجود ہے۔ اس کے بعد یورپ کے مسیحی اہلِ علم پوری طرح سائنسی تحقیق کے میدان میں سرگرم ہوگئے، یہاں تک کہ انھوں نے تاریخ میں پہلی بار ایک نیا دور پیدا کر دیا جس کو عام طور پر جدید تہذیب (modern civilization) کہا جاتا ہے۔

قابلِ تقلید ماڈل

قرآن کی سورہ الصّف میں پیروانِ مسیح کے اِس ماڈل کو اہلِ ایمان کے لیے قابلِ تقلید ماڈل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اِس سے مراد خاص طور پر پیروانِ مسیح کی تاریخ کے یہی دو واقعات ہیں۔ پہلا واقعہ وہ ہے جو حضرت مسیح کے بعد کی ابتدائی صدیوں میں پیش آیا، اُس وقت پیروانِ مسیح کو سخت طور پر ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا تھا، لیکن انھوں نے اس کے مقابلے میں ردعمل کا طریقہ اختیار نہیں کیا، بلکہ وہ طریقہ اختیار کیا جو حضرت مسیح نے اُن کو اِن الفاظ میں بتایا تھا — اپنے دشمن سے محبت کرو۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ دوسروں کی طرف سے اگر تم کو دشمنی کا تجربہ ہو تب بھی تم اپنے آپ کو منفی نفسیات سے بچاؤ اور یک طرفہ طور پر پرامن طریقہ اختیار کرتے ہوئے دوسروں تک اپنا پیغام پہنچاؤ۔

پیروانِ مسیح کے ماڈل میں دوسرا نمونہ وہ ہے جو صلیبی جنگوں کے بعد سامنے آیا، یعنی عسکری میدان میں ناکامی کے بعد اپنے میدانِ عمل کو بدل دینا، جیسا کہ پیروانِ مسیح نے کیا۔ انھوں نے مسلح کروسیڈ کے میدان میں اپنی کوششوں کو بے نتیجہ پایا تو انھوں نے ڈائورژن کا طریقہ اختیار کیا، اِس طرح کہ عسکری میدان کو چھوڑ کر پرامن سائنسی میدان میں اپنے آپ کو سرگرمِ عمل کر لیا۔

امت مسلمہ کی کوتاہی

عجیب بات ہے کہ سورہ الصّف میں مسلمانوں کو جو عملی نصیحت کی گئی تھی، اس کو وہ اختیار نہ کر سکے۔ مسلمانوں سے یہ مطلوب تھا کہ وہ پیروانِ مسیح کے اُس ماڈل کو اپنائیں جس کو قرآن میں پیشگی طور پر بتا دیا گیا تھا۔ یہی وہ پرامن ماڈل ہے جس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے

موقع پر اختیار فرمایا تھا۔ مگر مسلمان بحیثیت قوم اِس سے بے خبر رہے، وہ اِس ماڈل کو اپنانے میں ناکام رہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں اِس کی دو بڑی مثالیں موجود ہیں۔

پہلی مثال وہ ہے جو نوآبادیاتی طاقتوں کے ظہور کے بعد پیش آئی۔ اِس دور میں یورپ کی نوآبادیاتی طاقتوں نے مسلمانوں کی سلطنتوں کو توڑ دیا اور ان کے سیاسی دبدبے کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد مسلمان منفی ردعمل کی نفسیات کا شکار ہو گئے۔ وہ نفرت اور انتقام اور تشدد میں مبتلا ہو کر رہ گئے، حالاں کہ قرآن میں بیان کردہ پیروانِ مسیح کے ماڈل کے مطابق، انھیں یہ کرنا تھا کہ وہ پُرامن طریق کار اختیار کرتے، یعنی وہ میدانِ جنگ کو چھوڑ کر میدانِ دعوت میں آجاتے، جن لوگوں کو وہ اپنا حریف سمجھ کر اُن سے متشددانہ ٹکراؤ کر رہے تھے، اُن کو مدعو کا درجہ دے کر وہ ان کے اوپر پرامن دعوہ ورک شروع کر دیتے۔ اگر مسلمان ایسا کرتے تو یقیناً اُن کے اوپر قرآن کے وہ الفاظ صادق آتے جو اِس سے پہلے پیروانِ مسیح کے اوپر صادق آچکے تھے، یعنی: فأیدنا الذین آمنوا علی عدوّھم فأصبحوا ظاھرین (61:14)

پیروانِ مسیح کے ماڈل میں دوسرا نمونہ وہ تھا جو صلیبی جنگوں کے بعد ظہور میں آیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دنیا کے اوپر پہلی بار فطرت کے قوانین (laws of nature) منکشف ہوئے اور جدید تہذیب وجود میں آئی جس کے نتیجے میں پوری انسانیت کو بے شمار فائدے حاصل ہوئے۔

اِس دوسرے معاملے میں بھی مسلمان پوری طرح ناکام ہو گئے۔ قرآن میں بیان کردہ پیروانِ مسیح کے ماڈل میں ان کے لیے یہ پیغام تھا کہ مغربی قوموں سے مقابلہ آرائی میں جب باعتبار نتیجہ وہ ناکام ہو جائیں تو وہ اپنی پالیسی پر نظر ثانی (revision) کریں۔ اِسی نظر ثانی کو قرآن میں اجتماعی توبہ (24:31) کہا گیا ہے۔ نظر ثانی کا وہ عمل یہ تھا کہ مسلمان اپنی کوششوں کو ٹکراؤ کے میدان سے ہٹائیں اور وہ اپنے آپ کو پوری طرح تعمیری کام میں لگا دیں، مگر مسلمان نفرتِ مغرب میں اتنی شدت سے مبتلا ہوئے کہ ان کے اندر یہ تعمیری سوچ پیدا نہ ہو سکی۔

اگر مسلمان اپنی منفی نفسیات سے باہر آکر مثبت انداز میں سوچتے تو اُن کو معلوم ہوتا کہ مغرب کی مسیحی قوموں نے جو کارنامہ انجام دیا ہے، وہ عین اُن کی اپنی موافقت میں ہے۔ اِس کے نتیجے میں جو جدید

تہذیب وجود میں آئی ہے، اس نے مسلمانوں کے لیے خدمتِ دین اور اشاعتِ اسلام کے نئے وسیع تر دروازے کھول دیے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشگی طور پر فرمایا تھا کہ بعد کے دور میں اللہ تعالی کچھ سیکولر لوگوں کو کھڑا کرے گا جو دین کے حق میں تائیدی رول (supporting role) انجام دیں گے۔ مغرب کی مسیحی قوموں کا کارنامہ اِسی قسم کا تائیدی کارنامہ تھا۔ اِس موقع پر مسلمانوں کو چاہئے تھا کہ وہ مغربی قوموں کے خلاف نفرت اور تشدد کی پالیسی کو مکمل طور پر ختم کر دیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ان کے اندر ایک نیا مثبت ذہن ابھرتا۔ اس کے بعد وہ جان لیتے کہ مغربی قوموں نے ان کے لیے کتنا بڑا تائیدی کام انجام دیا ہے۔

اِس تائیدی کام کا ایک پہلو وہ ہے جس کو قرآن میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے — عن قریب ہم اُن کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور انفس میں بھی، یہاں تک کہ ان کے اوپر یہ آشکارا ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے (40:53)۔ قرآن کی اِس آیت میں جن چیزوں کو آیات (signs) کہا گیا ہے، اُن سے مراد وہی سائنسی حقیقتیں ہیں جو پہلی بار مغربی قوموں کے ذریعے انسان کے علم میں آئیں۔ یہ سائنسی دریافتیں بے شمار پہلوؤں سے اسلام اور دعوتِ اسلام کے لیے مفید اور معاون ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ساتویں صدی میں جو اسلامی انقلاب آیا تھا، وہ ایک پہلو سے تاریخ میں ایک نئے عمل (process) کا آغاز تھا۔ یہ عمل تدریجی طور پر اپنا کام کرتا رہا۔ نشاۃِ ثانیہ کے بعد یورپ میں جو انقلابات آئے، وہ سب اِسی تاریخی عمل کی تکمیل تھے۔ مثلاً افکار کے معاملے میں کھلا پن (intellectual openness)، مذہبی آزادی، تشدد کے طریقے کا بحیثیت اصول ختم ہو جانا، بادشاہت کے بجائے جمہوریت کا نظام، پرنٹنگ پریس کا دور، وغیرہ۔

اِس قسم کی تمام تبدیلیاں جو مغربی تہذیب کے بعد دنیا میں آئیں، وہ سب خود اسلام کا مطلوب تھیں۔ اِن تبدیلیوں کے ذریعے یہ ممکن ہو گیا کہ اسلام کی صداقت کو خالص علمی اعتبار سے مدلّل کیا جائے۔ جدید ٹکنالوجی اور کمیونکیشن نے اِس بات کو ممکن بنا دیا کہ اسلام کی اشاعت کو عالمی سطح پر انجام دیا جا سکے۔ اِس طرح کی بے شمار جدید چیزیں ہیں جو عین اسلام کے حق میں ہیں اور وہ عملاً سب کی سب مغربی تہذیب کے نتیجے میں انسان کو حاصل ہوئی ہیں۔

خاتمہ کلام

امتِ مسلمہ کی تاریخ اب اکیسویں صدی عیسوی میں پہنچ چکی ہے۔ اب آخری طور پر وہ وقت آ گیا ہے، جب کہ امت کے اندر وہ سوچ پیدا ہو جس کو قرآن کے اندر اجتماعی توبہ کہا گیا ہے، یعنی قومی پالیسی کو بدلنا۔ یہی امت مسلمہ کے مسائل کا واحد حل ہے۔ اِس کے سوا کوئی اور حل نہ ممکن ہے اور نہ مطلوب۔ پچھلی صدیوں میں جو حالات پیدا ہوئے، اس کے نتیجے میں، ساری دنیا کے مسلمانوں کے اندر منفی نفسیات کا ذہن پیدا ہوا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اپنی اصل حیثیت کو بھول گئے، یعنی یہ کہ وہ اللہ کے دین کے داعی ہیں اور دوسری قومیں ان کے لیے مدعو کا درجہ رکھتی ہیں۔

اصل حقیقت کے اعتبار سے، مسلمانوں اور دوسرے انسانوں کے درمیان داعی اور مدعو کی نسبت ہے، لیکن مسلمانوں کی منفی نفسیات کی بنا پر یہ ہوا کہ مسلمانوں اور دوسرے انسانوں کے درمیان حریف اور رقیب کی نسبت قائم ہوگئی۔ موجودہ زمانے میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ مسلمانوں اور دوسرے انسانوں کے درمیان اِس نسبت کو درست کیا جائے۔ مسلمانوں کے اندر عمومی طور پر یہ سوچ پیدا کی جائے کہ وہ داعی ہیں اور دوسری قومیں ان کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِسی میں مسلمانوں کی دنیا کی کامیابی بھی ہے اور اِسی میں ان کی آخرت کی کامیابی بھی۔ (10 اپریل 2013)

دعوتی مقصد کے لیے مشرقی یوپی، خاص طور پر لکھنؤ اور اطراف کے قارئین، حسب ذیل پتے پر رابطہ قائم کریں:

Madrasa S. Umar Farooq
Rustam Nagar, Chawk, Lucknow-226 003
Mob. +91-9839801027
E-mail: msuflko@gmail.com

کشمیر میں موجود بے شمار دعوتی مواقع کو استعمال کرنے کے لیے ایک منظم دعوتی مہم چلائی جا رہی ہے۔ جو لوگ اِس پروگرام میں شامل ہونا چاہتے ہیں، وہ حسب ذیل پتے پر رابطہ کریں:

Al-Quran Mission, Kashmir
Email: kwc.beerwah@gmail.com, Mob. 9419488008

سادہ فارمولا

موجودہ زمانے کے مسلمان مختلف قسم کے مسائل کا شکار ہیں۔ مثلاً فقہی مسائل، سیاسی مسائل، اور بین اقوامی مسائل، وغیرہ۔ مسائل کے حل کا صحیح فارمولا وہ ہے جو حالات کی نسبت سے قابل عمل ہو۔ اِس اعتبار سے دیکھئے تو مذکورہ مسائل کا سادہ فارمولا یہاں حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے:

فقہی مسائل میں توسع، سیاسی مسائل میں شورائیت، اور مشترک مسائل میں بین اقوامی رواج کو مان لینا۔

فقہی (عبادتی) مسائل میں اختلاف کا اصل سبب یہ ہے کہ صحابہ کی روایتیں عبادات کے فارم کے معاملے میں مختلف ہیں۔ ایسی حالت میں اِس مسئلے کا آسان حل یہ ہے کہ اِن اختلافات کو توسع پر محمول کیا جائے۔ یہ مسلک حدیثِ رسول کے مطابق ہوگا، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے بارے میں فرمایا: بأیھم اقتدیتم اھتدیتم (کشف الخفاء، جلد 1، صفحہ 146)

سیاسی مسائل میں شورائیت کا مطلب یہ ہے کہ سیاست میں کوئی شخص اپنا معیار چلانے کی کوشش نہ کرے۔ عوامی رائے کے مطابق، جو بات طے ہو، اس کو مان لیا جائے۔

مذہبی معاملات میں افراد کو آزادی دیتے ہوئے، سیاسی اقتدار کے معاملے کو جمہوری عمل (democratic process) کے حوالے کر دیا جائے۔

مشترک مسائل میں بین اقوامی رواج کو مان لینے کا مطلب یہ ہے کہ بین اقوامی معاملے میں اُس اصول کو اختیار کر لینا جس کو اُس وقت انٹرنیشنل نارم (international norm) کا درجہ حاصل ہو۔ مسائل کا حل ہمیشہ حقیقت پسندی میں ہوتا ہے، نہ کہ معیار پسندی میں۔ اجتماعی زندگی میں کوئی بھی شخص اپنے ذاتی معیار کو نہیں چلا سکتا، اِس لیے اجتماعی زندگی میں ضروری ہوتا ہے کہ دوسروں کی رعایت کی جائے، دوسروں کے ساتھ ایڈجسٹ کرتے ہوئے اپنے عمل کا منصوبہ بنایا جائے۔

پیرانوئیا کی نفسیات

آپ انٹرنیٹ کھولیں تو آپ کو اُس میں دو اصطلاحیں ملیں گی — جوئش پیرانوئیا (Jewish Paranoia) اور مسلم پیرانوئیا (Muslim Paranoia)۔ دونوں عنوانات کے تحت آپ کو بہت سے مضامین ملیں گے۔ اِن مضامین کے مطالعے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اپنے بعد کے زمانے میں، یہود اور مسلمان دونوں، ایک ہی نفسیات کا شکار ہوئے۔ یہ نفسیات وہی ہے جس کو اصطلاحی طور پر پیرانوئیا (paranoia) کہا جاتا ہے۔ پیرانوئیا کا مطلب ہے: فریب خوردگی (delusion) میں جینا۔

یہود اور مسلمانوں کی اِس فریب خوردگی کا مشترک سبب اُن کی قومی تاریخ ہے۔ دونوں کے ساتھ یہ ہوا کہ قدیم زمانے میں اُن کو قومی برتری اور سیاسی دبدبہ ملا۔ اِس کے بعد دونوں کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ کچھ قومیں ابھریں جنھوں نے دونوں کی قومی برتری اور سیاسی دبدبے کو ختم کر دیا۔ یہ واقعہ پہلے، یہود کے ساتھ پیش آیا اور اس کے بعد مسلمانوں کے ساتھ۔ یہ واقعہ قانونِ فطرت کے تحت ہوا تھا، لیکن دونوں نے اُس کو ''غیروں'' کی سازش قرار دے دیا۔

اِس سے دونوں کے اندر جو مریضانہ ذہنیت پیدا ہوئی، اُسی کا نام پیرانوئیا ہے۔ اِس ذہنیت کے نتیجے میں مشترک طور پر جو ہوا، وہ یہ تھا — اپنے بارے میں فرضی فخر (false pride) اور دوسرے کے بارے میں فرضی نفرت (false hate)۔ اِس بگڑے ہوئے مزاج کے تحت دونوں کے اندر جو برائیاں پیدا ہوئیں، اُن میں سے ایک مشترک برائی یہ تھی کہ دونوں نے دعوت کا وہ کام چھوڑ دیا جس کی ذمے داری اُن پر خدا کی طرف سے ڈالی گئی تھی۔

اِس سلسلے میں یہود کے کیس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ (3:187) یعنی یہود سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ تم ضرور اس کو لوگوں کے سامنے بیان کرو گے اور اس کو نہ چھپاؤ گے، لیکن

انھوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا۔ اِس سلسلے میں مسلمانوں کی ذمے داری کو قرآن کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے: لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (22:78)

یہ ایک حقیقت ہے کہ یہود نے اپنے بعد کے زمانے میں تبیینِ حق کی ذمے داری کو چھوڑ دیا، حتی کہ اِس حکم کی فرضیت اُن کے لیے ایک نامعلوم چیز بن گئی۔ انھوں نے بطور خود یہ عقیدہ بنالیا کہ نجات (salvation) صرف یہود (بنی اسرائیل) کے لیے ہے۔ غیر یہود کے لیے نجات ہی نہیں۔ ٹھیک یہی حال بعد کے زمانے میں مسلمانوں کا ہوا۔ دعوت یا شہادت علی الناس کا حقیقی تصور ان کے ذہن سے حذف ہوگیا۔ ان کی تفسیریں، اُن کی شرحیں اور ان کی تیار کردہ کتابیں دعوت الی اللہ کے حقیقی تصور سے خالی ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو ''خیرامت'' کا درجہ دے رکھا ہے اور دوسروں کو انھوں نے عملاً ''کافر'' کا درجہ دے کر اُن کو نظر انداز کر دیا ہے۔

موجودہ زمانے میں کچھ لوگوں نے بظاہر دعوت کے نام سے ادارے قائم کیے ہیں، اور اس کے تحت کچھ سرگرمیاں کر رہے ہیں، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے، یہ سرگرمیاں دعوتی سرگرمیاں نہیں۔ ان کی سرگرمیوں کو دو قسم میں تقسیم کیا جاسکتا ہے — ایک، وہ لوگ ہیں جو دعوت کے نام پر ڈبیٹ (debate) کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کے مذہب پر مسلمانوں کے مذہب کی برتری ثابت کرتے ہیں۔ اِس سے مسلمانوں کے جذبہ فخر کو تسکین ملتی ہے۔ مسلمان اُن کی تقریروں پر خوش ہوکر تالیاں بجاتے ہیں، مگر اس قسم کا ڈبیٹ صرف ایک قومی کام ہے، اس کا دعوت سے کوئی تعلق نہیں۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو دعوت کا نام لیتے ہیں، لیکن عملاً اُن کا کام یہ ہے کہ وہ عوام کے اندر جائیں اور پراسرار قسم کے بے اصل قصے کہانیاں سنا کر وقتی طور پر لوگوں سے کلمہ پڑھوائیں۔ اِس طرح کے کام سے مسلمان خوش ہوتے ہیں اور ایسے لوگوں کا تعاون کرتے ہیں، اِس لیے کہ اِس کام میں مسلمانوں کو یہ نفسیاتی تسکین ملتی ہے کہ اُن کی قوم کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

دعوت الی اللہ کے کام کا نہ قومی فخر سے کوئی تعلق ہے اور نہ قومی تعداد بڑھانے سے۔ دعوت الی اللہ تمام تر شہادت علی الناس کا کام ہے۔ دعوت کا کام انسانوں کی خیر خواہی میں خالص آخرت کے

جذبے کے تحت ہوتا ہے۔ دعوت کا کام کیا ہے، اس کی حقیقت قرآن کی اِس آیت سے معلوم ہوتی ہے:
رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (4:165)۔

پچھلی تاریخ میں کئی بار ایسا ہوا کہ کچھ طاقتوں نے فلسطین میں یہودیوں کے خلاف پر تشدد کارروائیاں کیں۔ اِس کے بعد یہود کی تاریخ میں ایک ظاہرہ پیدا ہوا جس کو ڈائس پورا (diaspora) کہا جاتا ہے، یعنی اپنے وطن سے ہجرت کرنا اور دوسرے مقام پر جا کر آباد ہونا۔

اِس طرح جو یہود فلسطین کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں گئے، وہ اپنی علاحدہ قومی شناخت (identity) کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ چناں چہ وہ جس ملک میں گئے، وہاں انھوں نے اپنی علاحدہ بستیاں بنائیں۔ اِن بستیوں کو گھیٹو (ghetto) کہا جاتا ہے۔ اپنی شناخت برقرار رکھنے کے نام پر اِس طرح علاحدہ بستیاں بنانا کوئی سادہ بات نہ تھی۔ اِس طرح علاحدہ رہنے کی وجہ سے اُن کے اندر ایک ذہنیت پیدا ہوئی جس کو گھیٹو میںٹلٹی (ghetto mentality) کہا جاتا ہے۔ بعد کے زمانے میں خود یہودیوں میں گھیٹو کا یہ کلچر باقی نہ رہا۔ وہ تعلیم اور دوسرے جدید شعبوں میں دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ اِس طرح یہودیوں کے اندر گھیٹو میںٹلٹی بڑی حد تک ختم ہوگئی۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے اندر بھی یہی کلچر رائج ہوا، یعنی مسلم شناخت کے نام پر دوسروں سے الگ ہو کر رہنا۔ یہ صورتِ حال تادمِ تحریر برقرار ہے۔ اِس روش نے مسلمانوں کے اندر بہت بڑے پیمانے پر گھیٹو ذہنیت پیدا کر دی۔ اِسی گھیٹو ذہنیت کا ایک سیاسی مظاہرہ وہ تھا جس کو پاکستانائزیشن (Pakistanization) کہا جا سکتا ہے۔

اِس پاکستانائزیشن کے نام پر موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا ہے، اُس کی کوئی مثال پچھلی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ موجودہ زمانے میں پاکستانائزیشن کی پالیسی اسلام کے نام پر اختیار کی گئی، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ صرف سیاسی گھیٹو ازم (political ghettoism) تھا، اِس کے سوا اور کچھ نہیں (25 جنوری 2013)

اسلام اور مسلمان

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنا مشن شروع کیا۔ ابتدائی مشکلات کے بعد آپ کا مشن نہایت تیزی کے ساتھ پھیلا، یہاں تک کہ تقریباً 50 سال کے عرصے میں آپ کے ماننے والوں نے ایشیا اور افریقہ اور یورپ میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرلیں۔ مسلمانوں کا یہ دبدبہ تقریباً ایک ہزار سال تک جاری رہا۔ اِس کے بعد وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (3:140) کے فطری قانون کے تحت حالات بدلے۔ یورپ میں نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کا دور آیا۔ یورپی قومیں نئی طاقتوں سے مسلح ہوکر دنیا کے بیش تر حصے میں پھیل گئیں۔ یہ وہی دور تھا جس کو مسلم ایمپائر کا دور کہا جاتا ہے۔ فطری طور پر یورپی قوموں کا مقابلہ براہِ راست مسلم سلطنتوں سے ہوا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کا آخری زمانہ اِس معاملے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ ایک طرف، عثمانی سلطنت کو یورپی طاقت کے مقابلے میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ 1770 میں ترکوں کے مضبوط بحری بیڑے کو ایک لڑائی میں میڈی ٹیرینین سمندر میں تباہ کردیا گیا:

The Ottoman naval establishment was wiped out at the Battle of Çeşme (1770) by a Russian fleet. (EB. 13/784)

اِس سلسلے میں دوسرا واقعہ ہندستان میں پیش آیا۔ اُسی زمانے میں برٹش فوجیں ہندستان میں داخل ہوئیں اور تیزی سے پیش قدمی کرنے لگیں۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں اُن کا مقابلہ میسور کے سلطان ٹیپو سے پیش آیا۔ برٹش فوجیں کامیاب ہوئیں اور 1799 میں انھوں نے سرنگاپٹنم میں سلطان ٹیپو کو ہلاک کرکے میسور کی سلطنت پر قبضہ کرلیا۔ اُس وقت سلطان ٹیپو کی لاش کے پاس کھڑے ہوکر جنرل ہیرس (George Harris) نے فاتحانہ انداز میں کہا تھا کہ — آج ہندستان ہمارا ہے:

Today, India is ours!

نئی سوچ کی ضرورت

اِس کے بعد مغربی قوموں کے خلاف مسلمانوں کا ٹکراؤ شروع ہوا۔ یہ ٹکراؤ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے درمیان دو صدیوں تک مسلسل جاری رہا۔ اِس طویل جنگ میں مسلمانوں کو ساری دنیا میں یک طرفہ طور پر تباہی سے دوچار ہونا پڑا۔ اب اِس تباہ کن لڑائی کی تاریخ اکیسویں صدی میں پہنچ چکی ہے۔ اب حالات اُس سنگین حد تک پہنچ چکے ہیں، جب کہ اِس تباہ کن لڑائی کو مزید جاری رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ اب آخری طور پر وہ وقت آ گیا ہے کہ مسلمانوں کے علما اور دانش ور یہ فیصلہ کریں کہ اب ہمیں پورے معاملے کا ازسرِ نو جائزہ لینا ہے۔ اب ہمیں ماضی کی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے احیاءِ ملت کی نئی منصوبہ بندی کرنا ہے۔ دو سو سال کا ناکام تجربہ یہ جاننے کے لیے کافی ہے کہ ماضی کی پالیسی کو بدستور جاری رکھنا، اب صرف دیوانگی ہے، نہ کہ کوئی دانش مندی۔

اسلام کے عملی اصول میں سے ایک اصول وہ ہے جس کو نظر ثانی (reassessment) کا اصول کہا جا سکتا ہے۔ فطرت کے نظام کے مطابق، یہ ممکن ہے کہ آدمی نظریہ (ideology) کی سطح پر ہمیشہ ایک ہی آئڈیل اصول پر قائم رہے، لیکن عمل کی دنیا میں آنے کے بعد ہمیشہ پریکٹکل وزڈم (practical wisdom) کی ضرورت ہوتی ہے، یعنی عملی تقاضے کی نسبت سے اپنے منصوبے پر نظر ثانی کرنا، بدلے ہوئے حالات کے مطابق، ازسرِ نو اپنے عمل کا نقشہ بنانا۔ یہ اسلام کا تقاضا بھی ہے اور عقل کا تقاضا بھی۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں پر اب آخری طور پر وہ وقت آ گیا ہے کہ وہ اِس عملی اصول کے تحت اپنی سرگرمیوں کا ازسرِ نو جائزہ لیں اور حقائق (realities) کی بنیاد پر اپنے عمل کا نیا نقشہ بنائیں، جو حالات کے مطابق، قابلِ عمل بھی ہو اور نتیجہ خیز بھی۔

اسلامی لٹریچر کا معاملہ

اسلام استثنائی طور پر ایک ایسا مذہب ہے جس کا اصل متن (original text) آج بھی محفوظ طور پر موجود ہے۔ یہی متن (قرآن اور سنت) اسلام کی تعلیمات کو جاننے کا واحد ماخذ ہے۔ اسلام کا یہ تاریخی پہلو اسلام کی ایک ایسی خصوصیت ہے جو کسی بھی دوسرے مذہب کو حاصل نہیں۔ مگر اسلام کی بعد کی

صدیوں میں یہ ہوا کہ اسلام کے متن کی تشریح وتفصیل کے طور پر ہزاروں کتابیں عربی زبان میں لکھی گئیں۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے یہ ہوا کہ بعد کو لکھی جانے والی یہ کتابیں شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلام کا اصل ماخذ قرار پا گئیں۔ اب یہی کتابیں مدرسوں اور اداروں اور لائبریریوں میں استعمال ہوتی ہیں، ہر جگہ اُنھیں کا چرچا ہوتا ہے، حتی کہ عملاً اب قرآن اور سنت کی حیثیت ثانوی ہوگئی ہے اور بعد کو پیدا ہونے والے لٹریچر کو بلا اعلان اسلام کے اولین لٹریچر کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

اب موجودہ مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ فکری حیثیت سے وہ دینِ منزّل پر کھڑے ہوئے نہیں ہیں، اب عملاً وہ اُس دین پر کھڑے ہوئے ہیں جو بعد کی صدیوں میں مسلم علما نے اصل دین کی تشریح وتفصیل کی حیثیت سے بطور خود مدوّن کیا۔ مسلمانوں کی یہ صورتِ حال پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس پیشین گوئی کی تصدیق ہے جو حدیث کی کتابوں میں اِن الفاظ میں آئی ہے: من اقتراب الساعة أن يرفع الأشرار، ويوضع الأخيار، ويوضع في القوم المثناة، ليس أحد يغيرها، قيل: وما المثناة- قال: كتاب كتب سوى كتاب الله عز وجل (المستدرك على الصحيحين، رقم الحديث: 8782) یعنی قرب قیامت کی ایک علامت یہ ہے کہ برے لوگوں کو بلندی حاصل ہوجائے گی، اور اچھے لوگوں کو ذلیل کیا جائے گا، اور لوگوں کے درمیان 'مِثناۃ' کا رواج عام ہوجائے گا، کوئی نہ ہوگا جو اس کی تغییر کرے۔ پوچھا گیا کہ مثناۃ کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ کی کتاب کے سوا لکھی جانے والی کتابیں۔

اِس حدیث میں دراصل امتِ مسلمہ کے زوال کی حالت کو بتایا گیا ہے۔ جب ملت پر زوال کا دور آتا ہے تو اس کی حالت بھی وہی ہوجاتی ہے جو دوسری ملتوں کی ہوئی، یعنی لوگ ظاہر پسند بن جاتے ہیں۔ اُن کو معنوی حقائق دکھائی نہیں دیتے، البتہ ظاہری چیزیں خوب نظر آتی ہیں۔ لوگوں کے اِس بگڑے ہوئے ذوق کی بنا پر اُن کے درمیان دنیا پرست قسم کے لوگ ابھرتے ہیں اور آخرت پسند قسم کے لوگ غیر نمایاں بن جاتے ہیں۔ جو لوگ بگڑے ہوئے عوامی ذوق کو غذا فراہم کریں، وہ مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں اور جو لوگ اپنی سنجیدگی کی بنا پر عوامی ذوق کی رعایت نہ کر سکیں، وہ اُن کے درمیان

غیر مقبول بن جاتے ہیں۔ اُس وقت ایسے لوگ ابھرتے ہیں جو اگر چہ روحانی اعتبار سے خالی ہوتے ہیں، لیکن اپنے شان دار مذہبی لباس کے ذریعے وہ لوگوں کے درمیان اپنے کو نمایاں بنا لیتے ہیں۔ ان کے خوش نما الفاظ، ان کا بناوٹی انداز، ان کی بڑی بڑی باتیں عوام کو اپیل کرتی ہیں۔ ایسے لوگ حقیقت کے اعتبار سے، اگر چہ ''اشرار'' ہوتے ہیں، لیکن عوام کے بگڑے ہوئے ذوق کی بنا پر وہ اُن کے درمیان ''اَخیار'' کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی تقریر اور تحریر کو حدیث میں 'مثناۃ' کہا گیا ہے۔

مذکورہ حدیث میں اللہ کی کتاب کے سوا جن کتابوں کا ذکر ہے، اُن سے مراد عام کتابیں نہیں ہیں، بلکہ ان سے مراد وہ کتابیں ہیں جو امت کے بعد کے زمانے میں دینِ خداوندی کی تفسیر اور تشریح کے طور پر لکھی جائیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اِن قابلِ ترک کتابوں سے مراد وہ کتابیں ہیں جو اُس زمانے میں لکھی جائیں جو 'قُرون مشہود لہا بالخیر' کے بعد کا زمانہ ہے۔ اِس قسم کی کتابیں پچھلی امتوں کے زمانۂ مابعد میں لکھی گئی تھیں، اِسی طرح وہ یقینی طور پر خود امتِ مسلمہ کے زمانۂ مابعد میں بھی لکھی جائیں گی۔ اِس معاملے میں کسی حاملِ کتاب امت کا کوئی استثنا (exception) نہیں۔

بعد کے زمانے میں لکھی جانے والی کتابیں دو قسم کی ہو سکتی ہیں — ایک وہ جو کتاب اللہ کے گہرے مطالعے کے بعد اس کی حقیقی وضاحت کے طور پر لکھی جائیں۔ اور دوسری کتابیں وہ ہیں جو دورِ زوال میں لوگوں کے بگڑے ہوئے ذوق کی رعایت کے طور پر لکھی جائیں۔ مذکورہ حدیث میں 'مثناۃ' کے نام سے جن کتابوں کا ذکر ہے، وہ یہی دوسرے قسم کی کتابیں ہیں۔ امتِ مسلمہ کے بعد کے دور میں جو کتابیں لکھی گئیں، وہ اُس وقت لکھی گئیں، جب کہ مسلمان ایک نظریاتی گروہ کی حیثیت سے باقی نہیں رہے تھے، بلکہ وہ عام قوموں کی طرح ایک قوم بن چکے تھے، چناں چہ اِن کتابوں میں ایک مشترک خامی یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے قومی ذہن کی عکاسی کرتی ہیں، نہ کہ اسلام کے اصولی موقف کی۔

بعد کے دور میں مسلمان دوسری قوموں کو مدعو کے بجائے محکوم کی نظر سے دیکھنے لگے، اِس لیے ایسا ہوا کہ بعد کے دور میں پیدا ہونے والے لٹریچر میں دعوت الی اللہ کا باب حذف ہو گیا۔ بعد کے دور میں

جب کہ مسلمانوں کا پولٹکل ایمپائر قائم ہوا، اُس وقت مسلمانوں میں عام طور پر سیاسی طرز فکر پیدا ہو گیا۔ اِس سیاسی ذہن کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد کے مسلمانوں میں جہاد کے نام پر قتال (جنگ) کا تصور غالب آ گیا، حتی کہ قتال اُن کے لیے مذہبی عقیدے کا جز بن گیا، جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قتال کو صرف ضرورتِ شدیدہ (law of necessity) کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔

بعد کے دور میں مسلمانوں کو جو دبدبہ حاصل ہوا، اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر عام طور پر فخر (pride) کا ذہن پیدا ہو گیا۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں، اپنے آپ کو برتر سمجھنے لگے۔ اِسی ذہن کا یہ نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے زیر قبضہ علاقوں کو 'دار الاسلام' اور دوسروں کے زیر قبضہ علاقوں کو 'دار الکفر' کہنا شروع کر دیا، حالاں کہ قرآن کے مطابق، تمام دنیا یکساں طور پر دار الانسان کی حیثیت رکھتی تھی۔ دار الکفر اور دار الاسلام کی اصطلاحیں سرتاسر مبتدعانہ اصطلاحیں ہیں جو بعد کے دور میں وضع کی گئیں۔ اِسی صورت حال کا یہ نتیجہ تھا کہ بعد کے زمانے میں اسلام کو صرف احکام اور قوانین کا ایک مجموعہ سمجھ لیا گیا، اِسی ذہن کا نتیجہ تھا کہ علما کے درمیان علم فقہ کو غلبہ حاصل ہو گیا اور قرآن اور حدیث عملاً فقہ کے تابع قرار پا گئے۔ دورِ زوال کا یہ بھی ایک ظاہرہ ہے کہ دین میں اسپرٹ (spirit) کی اہمیت گم ہو جاتی ہے اور ساری اہمیت فارم (form) کو حاصل ہو جاتی ہے۔ اِس فرق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دین میں ساری بحثیں فنی اور قانونی پہلوؤں پر مرتکز ہو جاتی ہیں۔ اِس کے نتیجے میں ایک شدید تر خرابی پیدا ہو جاتی ہے، یعنی بہت سے فرقوں کا وجود میں آنا۔ یہاں پہنچ کر ملتِ واحدہ، ملتِ متفرقہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

واقعات بتاتے ہیں کہ بعد کے دور میں ملتِ مسلمہ کے درمیان یہ تمام خرابیاں کامل طور پر پیش آئیں۔ اِن تمام خرابیوں کا سبب وہی چیز ہے جس کو مذکورہ حدیث میں 'مشتاۃ' کہا گیا ہے، **یعنی ملت کے دورِ زوال میں پیدا ہونے والا لٹریچر**۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے تمام فکری مسائل براہِ راست طور پر اِسی صورتِ حال کا نتیجہ ہیں۔ اب اِس صورتِ حال کا حل صرف ایک ہے، وہ یہ کہ قرون مشہود لہا بالخیر کے بعد مسلمانوں نے عربی زبان میں بطور خود جو لٹریچر تیار کیا، اُن سب کو اب مسلمانوں کے کلاسکل لٹریچر (classical literature) کا درجہ دے دیا جائے۔ اب دوبارہ کھلے ذہن

کے تحت قرآن اور سنت کا مطالعہ کیا جائے اور پھر ایسا لٹریچر تیار کیا جائے جو جدید ذہن کو ایڈریس کرنے والا ہو۔ بعد کے پیدا شدہ لٹریچر کی تاریخی حیثیت ہمیشہ باقی رہے گی، لیکن جہاں تک ماخذ کی بات ہے، اسلام میں مستند ماخذ کی حیثیت ہمیشہ قرآن اور سنت کو حاصل رہے گی۔

ایک ''روشن خیال'' مسلمان نے ایک بار لکھا تھا کہ — آج قرآن کو دوبارہ نازل ہونا چاہئے:

Quran has to be re-revealed today.

یہ ایک صحیح بات ہے جس کو غلط الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ آج ہم کو نئے قرآن کی ضرورت نہیں، ضرورت صرف یہ ہے کہ اسلوبِ عصر میں قرآن کی تبیین کی جائے۔ چناں چہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ:

Quran has to be re-defined today.

قرآن کی تمام تعلیمات ابدی ہیں تاہم اسلوب کلام کا تعلق مخاطب گروہ سے ہے، اِس لیے اسلوب کلام ہر دور میں بدلتا رہتا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ قرآن کی ابدی تعلیمات کو اسلوبِ عصر میں اِس طرح بیان کیا جائے کہ وہ آج کے لوگوں کے لیے قابل فہم بن سکیں۔

ملتِ مسلمہ کا کیس

ہجری کیلنڈر کے لحاظ سے آج محرم 1434 کی پہلی تاریخ ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت کی تھی، اُس پر اب 1433 سال گزر چکے ہیں۔ آپ کے زمانے میں جس ملتِ مسلمہ کی تشکیل ہوئی تھی، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ اب ختم ہو چکی ہے۔ آج جس کو ہم ملتِ مسلمہ کہتے ہیں، وہ ملت کی بعد کی نسلیں ہیں جو مختلف حالات سے گزرتے ہوئے اکیسویں صدی عیسوی میں داخل ہوئی ہیں۔ یہ فطرت کا قانون ہے کہ ہر امت اپنے بعد کے دور میں زوال کا شکار ہوتی ہے۔ موجودہ زمانے میں مسلمان دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ مسلمان، قرآن کی زبان میں، خیرِ امت (3:110) نہیں ہیں، وہ بعد کے دور میں وجود میں آنے والے ایک زوال یافتہ گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کا کیس وہی ہے جس کو قرآن میں 'طولِ امد' کے ذریعے پیدا ہونے والی قساوت (57:16) کا کیس کہا گیا ہے۔

تحریکوں کی ناکامی کا سبب

پچھلے دوسو سال کے اندر مسلم علما اور مسلم رہنماؤں نے ملت کے احیا کے لیے بہت سی بڑی بڑی تحریکیں اٹھائیں اور بہت سی بڑی بڑی جماعتیں بنائیں۔ اِن تحریکوں اور جماعتوں کے تحت جو پُرجوش سرگرمیاں جاری ہیں، ایک فارسی شاعر کے الفاظ میں، اُن کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ:

زمیں شش شد و آسماں ہشت شد

مگر یہ تحریکیں اپنے اعلان کردہ مقصد کے اعتبار سے مکمل طور پر ناکام رہیں۔ اِس کا سبب صرف ایک تھا، وہ یہ کہ اِن رہنماؤں نے موجودہ مسلمانوں کو ''خیر امت'' فرض کرکے اپنا کام شروع کیا، جب کہ اصل واقعہ یہ تھا کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا یہ انبوہ ایک زوال یافتہ گروہ کے درجے میں پہنچ چکا تھا۔

اصلاح کا آغاز افراد سے

دورِ زوال کی نفسیات یہ ہے کہ زوال اگرچہ عمومی سطح پر ہوتا ہے، لیکن اصلاح کا آغاز افراد کی سطح سے کیا جاتا ہے۔ دورِ زوال میں مجموعی اصلاح کا طریقہ سراسر بے معنی ہے۔ قرآن کے مطابق، صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایسی حالت میں کام کا آغاز اصلاحِ افراد سے کیا جائے، یعنی بھیڑ کو ایڈریس کرنے کے بجائے افراد کو ایڈریس کرنا۔ اصلاح کی اِس حکمت کو قرآن کی دو آیتوں میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے:

1- ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۙ وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (8:53) یعنی یہ اِس وجہ سے ہوا کہ اللہ اُس انعام کو جو وہ کسی قوم پر کرتا ہے، اُس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ اس کو نہ بدل دیں جو اُن کے نفسوں میں ہے۔ اور بے شک، اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

2- إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (13:11) یعنی بے شک، اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا، جب تک وہ اُس کو نہ بدل ڈالیں جو اُن کے نفسوں میں ہے۔

قرآن کی اِن دونوں آیتوں کا مطلب ایک ہے، وہ یہ کہ جب کوئی قوم عروج کے بعد زوال کا شکار ہوجائے اور اس کو دوبارہ عروج کی طرف لوٹانا ہو تو اصلاح کے کام کا آغاز مجموعی قوم کی سطح سے

شروع نہیں کیا جائے گا، بلکہ افراد کی سطح سے شروع کیا جائے گا۔ ایسا نہیں کیا جائے گا کہ یہ فرض کرلیا جائے کہ قوم تو موجود ہے، اب اُس کو صرف اجتماعی اقدام کی طرف متحرک کرنا ہے، بلکہ یہ تسلیم کیا جائے گا کہ قوم موجود نہیں ہے اور افراد کی اصلاح کرکے دوبارہ قوم کو وجود میں لانا ہے۔ یہی اللہ کا قانون ہے، اور اللہ کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی (33:62)۔

اِس معاملے کی ایک واضح عملی مثال موجودہ زمانے میں پائی جاتی ہے، اور یہ فلسطین اور پاکستان کی مثال ہے۔ دونوں کا کیس بالکل ایک ہے۔ فلسطین کا تعلق عرب دنیا سے ہے، اور پاکستان کا تعلق بقیہ مسلم دنیا سے۔ فلسطین اور پاکستان کا معاملہ گویا موجودہ زمانے میں اِس قانون الٰہی کو سمجھنے کے لیے عملی مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ فلسطین اور پاکستان دونوں کے کیس میں ایسا ہوا کہ قوم کی سطح پر ایک مسلم ملک وجود میں لانے کی کوشش کی گئی، مگر دونوں جگہ مکمل طور پر ناکامی ہوئی۔ فلسطین کا مسئلہ 1948 میں شروع ہوا۔ فلسطینی جدوجہد پر اب 60 سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ اِس جدوجہد میں جان و مال کی جو قربانی دی گئی ہے، وہ شاید پوری مسلم تاریخ کی تمام قربانیوں سے بھی زیادہ ہے، مگر انجام کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ پوری جدوجہد معکوس نتیجہ (counter productive) کی بدترین مثال ثابت ہوئی ہے۔

اِس معاملے میں دوسری مثال پاکستان کی ہے۔ پاکستان 1947 میں بنا۔ اِس سے پہلے برصغیر ہند کا پورا علاقہ ایک واحد ملک کی حیثیت رکھتا تھا جس میں مسلمان دوسری قوموں کے ساتھ آباد تھے۔ اُس وقت مسلمانوں کے کچھ رہنماؤں نے متحدہ ہندستان میں دوقومی نظریہ (two nation theory) چلایا۔ اُن کا کہنا تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ اُن کو اپنے مذہب کے مطابق، زندہ رہنے کے لیے ایک الگ ملک چاہیے۔ یہ تحریک اِس مفروضے پر قائم تھی کہ مسلم قوم کے نام سے ایک امت آل ریڈی موجود ہے، اب صرف اُس کو ایک علاحدہ خطۂ ارض کی ضرورت ہے۔ اُس زمانے میں ایک مسلم شاعر کا یہ شعر بہت مقبول ہوا:

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

جان و مال کی بے پناہ قربانی کے بعد 1947 میں جغرافی معنوں میں پاکستان وجود میں آ گیا، مگر معنوی اعتبار سے، پاکستان کا اب تک کوئی وجود نہیں۔ پاکستان میں نہ اسلام آیا اور نہ وہاں کے

مسلمانوں کو امن اور تحفظ حاصل ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج انڈیا کے مسلمان، اسلام اور امن وتحفظ دونوں اعتبار سے، پاکستان کے مسلمانوں سے بہت زیادہ بہتر حالت میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 1971 سے پہلے انڈیا کے مسلمان، پاکستان جانے کے لیے بے تاب رہتے تھے، مگر آج انڈیا کا کوئی مسلمان، پاکستان جانے کے لیے تیار نہیں، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ انڈیا میں وہ پاکستانی مسلمانوں کے مقابلے میں ہر اعتبار سے زیادہ بہتر حالت میں ہے۔

پاکستان بننے کے اول دن ہی سے وہاں باہمی ٹکراؤ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں کو گولی ماردی گئی۔ پاکستان کے مسلمانوں میں جو باہمی لڑائی شروع ہوئی، اس میں اب تک تقریباً 40 ہزار آدمی ہلاک ہوچکے ہیں۔ امریکا میں ایک آزاد تنظیم ہے۔ اس کا نام — فنڈ فار پیس (Fund for Peace) ہے۔ اِس تنظیم کا ایک کام یہ ہے کہ وہ ملکوں کے حالات کا سالانہ انڈیکس تیار کرتی ہے۔ اِس تنظیم نے 2011 میں ملکوں کا جو انڈیکس شائع کیا ہے، اس کے مطابق، پاکستان ایک ناکام ریاست (failed state) کی حیثیت اختیار کرچکا ہے۔

اِس ناکامی کا سبب یہ ہے کہ پاکستان کے مسلم رہنماؤں نے یہ فرض کرلیا کہ امتِ مسلمہ عملاً موجود ہے، اب صرف یہ ضرورت ہے کہ اس کو اقتدار حاصل ہوجائے، جب کہ اصل صورتِ حال یہ تھی کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، امتِ مسلمہ کا وجود ہی نہ تھا۔ جو چیز موجود تھی، وہ امت کے نام پر صرف ایک انبوہ تھا۔ ایسی حالت میں کام کا آغاز افراد کی اصلاح کرکے دوبارہ امت کو وجود میں لانا تھا۔ پاکستان کے مسلم رہنماؤں نے جو کچھ کیا، وہ گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا (putting the cart before the horse) تھا۔ اِس قسم کا غیر فطری منصوبہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا، اور پاکستان کے معاملے میں ایسا ہی ہوا۔

فلسطین کی تحریک میں تمام عرب دنیا براہِ راست طور پر اور بقیہ مسلم دنیا بالواسطہ طور پر شریک ہے، مگر بے پناہ قربانیوں کے باوجود ابھی تک ایسا نہیں ہوا کہ فلسطین میں عربوں کی مطلوب حکومت قائم ہوجائے۔ لیکن جہاں تک سبق کا تعلق ہے، وہ فلسطین کی مثال میں بھی پوری طرح موجود ہے۔

فلسطین میں اگر بالفرض عربوں کی حکومت قائم ہوجائے تو عملاً وہ بھی ایک ناکام ریاست ہی ثابت ہوگی، کیوں کہ فلسطینی عرب بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح صرف ایک انبوہ ہیں، نہ کہ تیار شدہ افراد۔ ایسی حالت میں بالفرض اگر فلسطین میں عربوں کی حکومت قائم ہوجائے تو فلسطین میں عملاً وہی ہوگا جو دوسرے عرب ملکوں میں ہو رہا ہے، یعنی یا تو سخت قسم کی ڈکٹیٹرشپ (dictatorship)، یا اگر بالفرض آزادی کا ماحول ہو تو خود فلسطینی مسلمانوں کے درمیان سخت قسم کی باہمی جنگ۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالات میں صرف ایک ہی محفوظ طریقہ باقی ہے، اور وہ ہے — اسٹیٹس کو ازم کا طریقہ، یعنی حالتِ موجودہ کو یک طرفہ طور پر تسلیم کر لینا۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر نفرت اور تشدد کا طریقہ ختم کر دیں۔ وہ اقدام کی نوعیت کی تمام سرگرمیوں کو مکمل طور پر بند کر دیں۔ وہ یوٹرن (U turn) لیتے ہوئے اپنے عمل کے میدان کو بدل دیں۔ وہ دوسروں سے ٹکراؤ کے بجائے خود اپنے افراد کی تعلیم و تربیت کی طرف لوٹ آئیں۔ وہ اپنی تمام طاقت کو ''اقدام'' کے بجائے ''تیاری'' پر مرتکز کر دیں۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے لیے زندگی کا یہی واحد راستہ ہے۔ اِس کے سوا جو کچھ ہے، وہ صرف ہلاکت ہے، نہ کہ زندگی۔ (17 نومبر 2012)

صدر اسلامی مرکز کے آڈیو اور ویڈیو لیکچرز کے لیے حسب ذیل لنکس ملاحظہ ہوں:

www.cpsglobal.org/videos.

www.alquranmission.org/podcasts.aspx.

قرآن کی عمومی اشاعت میں حصہ لینے کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

1. Fill the form at: www.alquranmission.org/QuranDistributor.aspx

Or

2. Send us a postcard with your Al Risala Numbe, Name, Complete Postal Address, Mobile number, Email id and the Area in which you would like to spread the Quran to the following address:

Al-Quran Mission

1, Nizamuddin West Market

New Delhi- 110013

اسلام کے نام پر سیاست

موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں بار بار ایک واقعہ پیش آیا ہے۔ ایک اسلام پسند جماعت (Islamist party) اٹھتی ہے۔ وہ اسلام کے نام پر سیاسی تحریک چلاتی ہے، یہاں تک کہ وہ موجودہ حکمرانوں کو ہٹا کر اپنی پارٹی کی حکومت بنا لیتی ہے۔ اِس واقعے پر ساری دنیا کے مسلمان خوشی مناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں ملک میں اسلام آ گیا۔ مگر بہت جلد معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز آئی، وہ اسلام نہیں تھا، بلکہ صرف یہ تھا کہ حکومت کا ڈھانچہ بدل گیا، یعنی یہ معاملہ تبدیلی افراد کا معاملہ تھا، نہ کہ تبدیلی نظام کا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اِس کا سبب سیاسی بے بصیرتی ہے جو موجودہ زمانے کے تقریباً تمام مسلمانوں پر چھائی ہوئی ہے، خواہ وہ علما ہوں یا غیر علما۔ وہ سیاسی بے بصیرتی یہ ہے کہ لوگ صرف لفظی نعروں کو جانتے ہیں۔ اُن کو یہ خبر نہیں کہ ''انقلاب'' کے نام پر جو واقعہ پیش آیا ہے، وہ صرف سیاسی اکھیڑ پچھاڑ کی بنا پر پیش آیا ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں اسلام کی بنا پر۔

اصل یہ ہے کہ جب بھی کچھ لوگ اقتدار کی کرسی پر ہوں، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، خواہ وہ مخلص ہوں یا غیر مخلص، ہمیشہ عوام میں اُن کے خلاف شکایت کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اجتماعی نظام میں اِس عنصر کو اینٹی انکمبنسی فیکٹر (anti-incumbency factor) کہا جاتا ہے۔ سادہ لفظوں میں اس کو اینٹی اتھارٹی (anti-authority) ماحول کہہ سکتے ہیں۔ جمہوری نظام میں اپوزیشن پارٹیاں ہمیشہ یہی کرتی ہیں کہ وہ برسرِ اقتدار گروہ کے خلاف موجود شکایتوں کو استعمال (exploit) کر کے اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

جن مسلم ملکوں میں یہ واقعہ پیش آ رہا ہے کہ وہاں نہایت دھوم کے ساتھ ''اسلام'' آیا اور پھر جلد ہی معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز آئی تھی، وہ اسلام نہ تھا، بلکہ صرف اربابِ اقتدار کی تبدیلی (replacement) تھی، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ صورتِ حال ہر اُس مسلم ملک میں پیش آئی جہاں نام نہاد اسلام پسند پارٹیاں سرگرم عمل ہیں۔

قبولِ اسلام کا ایک واقعہ

4 مارچ 2013 کو یہ واقعہ ہوا کہ نیدرلینڈ (Netherlands) کے ایک مشہور سیاسی لیڈر نے اسلام قبول کرلیا۔ اُن کا نام یہ ہے— ارناڈوان ڈارن (Ernaud Van Dorn)۔ دوسرے عہدوں کے علاوہ، وہ ڈچ پارلیامنٹ کے ممبر ہیں۔ انٹرنیٹ پر اِس واقعے کی خبر حسب ذیل عنوان کے تحت دیکھی جاسکتی ہے:

Anti-Islam Dutch Politician Converts to Islam

ارناڈوان ڈارن پہلے اسلام کے سخت مخالف تھے۔ بعد کو کچھ ایسے واقعات پیش آئے جس نے ان کے اندر ایک نیا تجسس پیدا کردیا۔ انھوں نے خاموشی کے ساتھ باقاعدہ طور پر اسلام کا مطالعہ شروع کردیا۔ آخر کار اُن کی فطرت جاگ اٹھی۔ انھوں نے کھلے طور پر ماضی میں اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا۔ وہ وہاں کی ایک مقامی مسجد (مسجد السنّۃ) میں گئے اور وہاں کے امام فواز الجنید کے سامنے کلمۂ شہادت ادا کرکے اپنے اسلام کا اعلان کردیا۔ اِس سلسلے میں میڈیا میں جو خبریں آئی ہیں، اس کی چند سطریں یہ ہیں— ہیگ میونسپل کاؤنسل کے ایک ممبر اور رائٹ ونگ فریڈم پارٹی کے سابق ممبر ارناڈوان ڈارن نے ٹویٹر پر اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کردیا ہے:

> The member of Hague municipal council and the former member of the right-wing Freedom Party, Ernaud Van Dorn, has announced his conversion to Islam through his account on Twitter.

قبولِ اسلام کے اِس طرح کے واقعات برابر میڈیا میں آتے رہتے ہیں۔ اِس طرح کے واقعات اِس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام فطرت کا دین ہے، جو انسان کی فطرت ہے، وہی اسلام ہے۔ اگر کوئی شخص بظاہر اسلام کا مخالف ہو تو اس کی مخالفت یقیناً غلط فہمی کی بنیاد پر ہوگی۔ آپ اس کی غلط فہمی کو دور کردیجئے اور پھر آپ دیکھیں گے کہ قرآن کے الفاظ میں، جو شخص اسلام کا دشمن بنا ہوا تھا، وہ اسلام کا دوست بن گیا ہے (41:34)۔

افرادسازی کی اہمیت

مشہور پاکستانی صحافی شورش کاشمیری (وفات: 1975) نے لکھا تھا کہ: ''اقبال وہ شبلی نعمانی ہے جسے کوئی سید سلیمان ندوی میسر نہ آسکا''۔ (ماہ نامہ الشریعہ، پاکستان، اپریل 2013، صفحہ: 7)

یہ تقابل درست نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ شبلی نے افرادسازی کا کام کیا، اِس لیے اُن کو افراد ملے۔ اِس کے برعکس، اقبال کا معاملہ یہ تھا کہ فردسازی عملاً ان کا کنسرن (concern) ہی نہ تھا۔ وہ ایک شاعر تھے اور شاعری کے ذریعے مجموعۂ ملت کو خطاب کرتے تھے۔ اِس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال کو مجموعۂ ملت کے اندر مقبولیت حاصل ہوئی، لیکن اُن کو نہ کوئی فرد ملا اور نہ افراد کی کوئی ٹیم۔

مجموعۂ ملت کو خطاب کرنا دوسرے الفاظ میں، بھیڑ (crowd) کو خطاب کرنا ہے اور بھیڑ کو خطاب کرنے سے کبھی افراد حاصل نہیں ہوتے، افراد کے حصول کا طریقہ بالکل جداگانہ ہے۔ اِس کے لیے ضرورت ہے کہ فرد کی نفسیات کو سمجھا جائے، فرد کے ذہن کو ایڈریس کیا جائے، فرد کو اپنا کنسرن بنایا جائے۔ یہ ایک بے حد مشکل کام ہے۔ اس کام کو صرف وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو ایک فرد کے ملنے کو اتنی زیادہ اہمیت دیں کہ، حدیث کے الفاظ میں، ایک فرد اُن کو ''سرخ اونٹوں'' (حمر النعم) کی فوج سے زیادہ قیمتی دکھائی دینے لگے۔ اقبال کا مشہور شعر ہے:

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی　　حُدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

اِس طرح کے کلام سے ایک بھیڑ کے اندر وقتی طور پر ہلچل پیدا کی جاسکتی ہے، لیکن اِس طرح کے پُرجوش کلام سے ایک فرد کے اندر شعوری انقلاب نہیں لایا جاسکتا۔ فرد کے اندر شعوری انقلاب لانے کے لیے صرف سنجیدہ کلام اور حقیقت بیانی کا انداز موثر ہوسکتا ہے (36:69)۔ کوئی فرد ہمیشہ ایک طویل فکری جدوجہد کے بعد تیار ہوتا ہے۔ شاعری اور خطابت کے ذریعے کسی شخص کو بھیڑ تو مل سکتی ہے، لیکن افرادِ کار اِس طرح کسی کو نہیں ملتے — فرد ہمیشہ فرد پر فوکس کرنے سے ملتا ہے، کوئی دوسرا طریقہ فردسازی کے لیے کارگر نہیں۔

عبرت یا عذاب

جرمن فلسفی نٹشے 1844 میں پیدا ہوا، اور صرف 56 سال کی عمر میں 1900 میں اس کا انتقال ہوگیا۔ وہ نہایت ذہین آدمی تھا۔ نٹشے کی عمر کے آخری کئی سال نہایت کس مپرسی میں گزرے۔ وہ کئی مہلک بیماریوں کا شکار ہوا، یہاں تک کہ وہ اپاہج ہوگیا۔ اس کا علمی کام مکمل طور پر ختم ہوگیا۔ آخر کار وہ ایک ناکام انسان کی حیثیت سے مر گیا:

"God is dead" is a widely quoted statement by German philosopher Friedrich Nietzsche. It first appears in his book *The Gay Science*, first published in 1882. On January 3, 1889, Nietzsche suffered a mental collapse. Nietzsche's mental illness was originally diagnosed as tertiary syphilis, in accordance with prevailing medical paradigm of the time. Some believe he suffered from manic-depressive illness with periodic psychosis, followed by dementia. In 1898 and 1899 Nietzsche suffered at least two strokes, which partially paralysed him and left him unable to speak or walk. After contracting pneumonia in mid-August 1900 he had another stroke during the night of August 24-25, and died about noon on August 25, 1900.

نٹشے کا معاملہ ''عذاب'' کا معاملہ نہ تھا۔ عذاب کا تعلق تمام تر آخرت سے ہے۔ نٹشے کا معاملہ دراصل عبرت کا معاملہ تھا۔ نٹشے کے واقعے میں یہ سبق ہے کہ اس دنیا میں منفی سوچ کسی کے لیے مفید نہیں ہوتی۔ نٹشے جس قسم کی سوچ ("God is dead") میں مبتلا ہوا، وہ پوری کائنات میں اجنبی ہے، وہ مکمل طور پر ایک خلافِ واقعہ سوچ ہے۔ اِس قسم کی خلافِ واقعہ سوچ آدمی کو غیر معتدل بنا دیتی ہے۔ اس کو ذہنی سکون (peace of mind) حاصل نہیں ہوتا، وہ مسلسل طور پر ٹنشن کا شکار رہتا ہے، کوئی علاج یا کوئی بھی تدبیر اس کو صحت عطا نہیں کرتی۔ اسی قسم کا عبرت ناک انجام دوسرے کئی ذہین لوگوں کا ہوا ہے۔ اُن میں سے ایک تازہ مثال رجنیش۔ اوشو۔ (وفات: 1999) کی ہے۔

ناعاقبت اندیشانہ اقدام

نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (22 اپریل 2013، صفحہ 14) میں ایک خبر پاکستان کے آئندہ انتخابات کے بارے میں چھپی ہے۔ اخبار نے اِس خبر کی سرخی اِن الفاظ میں قائم کی ہے — پاکستان کی انتخابی مہم میں کشمیر کا کوئی حوالہ نہیں:

Kashmir finds no mention in Pak poll campaigns.

یہ ایک عجیب بات ہے کہ انڈیا اور پاکستان دونوں ملکوں کی سیاست میں ایک مشترک چیز پائی جاتی ہے۔ دونوں ملکوں میں جلد ہی انتخابات ہونے والے ہیں، مگر حالت یہ ہے کہ انڈیا کی جس پارٹی نے اِس سے پہلے رام مندر کی تعمیر کو اپنے الیکشن مینی فیسٹو (election menifesto) میں سب سے زیادہ نمایاں اشو کا درجہ دیا تھا، اب اس کے الیکشن مینی فیسٹو میں رام مندر کی تعمیر کا کوئی ذکر نہیں۔

رام مندر کی تحریک اپنے نتیجے کے اعتبار سے، ہندو اور مسلم کے درمیان نفرت کا جنگل اگانے کی تحریک تھی۔ اِس قسم کا منفی جنگل خود پارٹی کے سیاسی مفاد کے خلاف تھا۔ چناں چہ انھوں نے جب اِس منفی نتیجے کو دیکھا تو حالات کے دباؤ کے تحت اِس تحریک سے عملاً کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اِسی طرح پاکستان میں کشمیر کی تحریک اپنے نتیجے کے اعتبار سے، پاکستان اور پڑوسی ملک کے درمیان نفرت اور تشدد کا آتش فشاں بھڑکانے کے ہم معنی تھی۔ چناں چہ عملاً ایسا ہی ہوا۔ پہلے یہ آتش فشاں انڈیا اور پاکستان کے درمیان بھڑکا اور بعد کو وہ خود پاکستان کے اندر بھڑک اٹھا۔ اِس منفی نتیجے کو دیکھ کر پاکستان کے لیڈر گھبرا اٹھے اور اب وہ چاہتے ہیں کہ کشمیر کے مسئلے سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے وہ اپنے ملک کی تعمیر کا نیا نقشہ بنائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں کسی اقدام سے پہلے ہمیشہ یہ سوچنا چاہئے کہ اس کا عملی نتیجہ کیا ہوگا۔ اگر نتیجہ برعکس نکلنے والا ہو تو اقدام کرنے سے بہتر یہ ہے کہ کوئی اقدام ہی نہ کیا جائے۔ یہ اصول اِس دنیا میں قوم کے لیے بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ فرد کے لیے۔

صلاحیت کی قدردانی

آسام پولس کے ایک سپاہی اندرا اپادھیائے کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس کا نام یہ تھا— کسان اپادھیائے۔ 1969 میں جب کہ وہ صرف چار سال کا تھا، وہ اپنی ایک بہن مایا کے ساتھ اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا۔ حالات نے اس کو کھٹمنڈو (نیپال) پہنچا دیا۔ ایک عرصے تک وہاں اس نے ایک ٹی اسٹال (tea stall) پر کام کیا۔ وہاں اس کو سخت نمونیہ ہو گیا۔ اس کی بہن مایا نے اس کو وہاں کے ایک اسپتال میں داخل کر دیا جس کو کرسچن مشنری کے لوگ چلا رہے تھے۔ کسان اپادھیائے اِس اسپتال میں چھ ماہ تک زیر علاج رہا۔

اِس دوران کسان اپادھیائے کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا۔ یہ واقعہ اُس کے لیے ایک نئی کامیابی کے ہم معنی بن گیا 1987 میں کسان اپادھیائے کی قسمت جاگی۔ ایک امریکی ڈاکٹر جو کہ کھٹمنڈو میں کام کرتا تھا، اس نے کسان اپادھیائے کے اندر کچھ خاص صلاحیت دیکھی اور اس کو پیش کش کی کہ وہ اسکالرشپ پر امریکا جائے اور وہاں تعلیم حاصل کرے:

> Luck shone on Kisan Upadhaya in 1987, when an American doctor working in Kathmandu saw something in him and offered him a scholarship to study in the US. (*The Times of India,* April 10, 2013, p. 13)

اب اِس واقعے پر 40 سال گزر چکے ہیں۔ کسان اپادھیائے اعلیٰ تعلیم کے بعد اب آئی ٹی اسپیشلسٹ (top-notch IT specialist) کی حیثیت سے امریکا میں مقیم ہیں— صلاحیت کی یہ قدردانی کسی قوم کی ترقی کا سب سے بڑا راز ہے۔ جس قوم کے اندر فرد کی صلاحیت کی قدردانی کا یہ مزاج پایا جائے، اُس قوم کی ترقی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ موجودہ زمانے میں امریکا کو جو ترقی حاصل ہوئی ہے، اس کا خاص سبب یہی ہے۔ امریکا میں سب سے زیادہ اہمیت کی چیز میرٹ (merit) ہے۔ امریکی سماج میں، میرٹ نوازی کا اصول ہے، نہ کہ خویش نوازی کا اصول۔

اقدام کی شرط

سویڈن (یورپ) کے شہر اسٹاک ہوم کا ایک عجیب واقعہ میڈیا میں رپورٹ کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اسٹیشن پر ایک کمیوٹر ٹرین (commuter train) خالی کھڑی ہوئی تھی۔ ایک 20 سالہ لڑکی جو ٹرین میں صفائی کا کام کرتی تھی، وہ ڈرائیور کے کیبن میں داخل ہوگئی۔ اس کو اتفاق سے ڈرائیور کی چابی مل گئی تھی، چناں چہ اس نے گاڑی کو اسٹارٹ کر دیا۔ گاڑی پٹری پر تیزی سے چلنے لگی۔ لڑکی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ٹرین کو کس طرح روکے۔ ٹرین چلتی رہی، یہاں تک کہ وہ پٹری سے اتر کر ریلوے لائن کے کنارے واقع ایک بلڈنگ سے ٹکرا گئی۔ اِس حادثے میں لڑکی سمیت بلڈنگ کے کئی افراد زخمی ہوئے۔ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (16 جنوری 2013) میں یہ خبر درج ذیل عنوان کے تحت دی گئی ہے:

Cleaning woman steals train, crashes it into house. (p. 22)

اِس واقعے میں ایک اہم سبق ہے، وہ یہ کہ کسی معاملے میں اقدام صرف اُس انسان کے لیے جائز ہے جو اپنے اقدام کے نتیجہ (result) کو جانتا ہو۔ جو شخص اپنے اقدام کے نتیجے کو نہ جانے، اُس کے لیے اقدام ہرگز جائز نہیں۔ کوئی آدمی اگر اتنا بے شعور ہے کہ وہ نتیجہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، اِس کے باوجود اگر وہ اقدام کر دیتا ہے تو یقینی طور پر اس کا انجام ہلاکت خیز ہوگا۔ اقدام کرنے والا خود بھی تباہ ہوگا اور اِسی کے ساتھ وہ دوسروں کی تباہی کا باعث بنے گا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک مقرر جذباتی تقریر کے ذریعے لوگوں کو ایک سمت میں دوڑا دیتا ہے، مگر وہ نہیں جانتا کہ روکنے کے وقت لوگوں کو وہ کس طرح روکے۔ ایسا آدمی صرف لوگوں کی تباہی میں اضافہ کرتا ہے، وہ ہرگز لوگوں کی تباہی میں کمی کرنے والا نہیں۔

گاڑی کو چلانا صرف اُس انسان کے لیے جائز ہے جو گاڑی کو روکنا بھی جانتا ہو۔ جو شخص گاڑی کو روکنے کا ہنر نہ جانے، اس کے لیے گاڑی کا چلانا سرے سے جائز ہی نہیں۔ یہ اصول جس طرح مادی ٹرین کے لیے درست ہے، اسی طرح وہ انسانی زندگی کے لیے بھی یکساں طور پر درست ہے۔

سب سے بڑی قربانی

قربانی (sacrifice) کا لفظ بولا جائے تو عام طور پر اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ — لڑ کر جان دے دینا۔ عام طور پر اِس کو شہادت سمجھا جاتا ہے، اور یہ کہ یہی شہادت سب سے بڑا عمل ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جسمانی قربانی سے زیادہ بڑی قربانی نفسیات کی قربانی ہے۔ سب سے بڑی قربانی سر کٹانا نہیں ہے، بلکہ سر جھکانا ہے۔ تاریخ میں بڑے بڑے کارنامے صرف اُن لوگوں نے انجام دئے ہیں جو اصول کی خاطر سر جھکانے کے لیے تیار ہو گئے۔

ایک بار میں امریکا کے ایک شہر میں گیا۔ وہاں امریکی مسلمانوں کی ایک بڑی تنظیم قائم تھی۔ اس کے ایک سینئر ممبر نے جوش کے ساتھ کہا کہ — اب میں نے لیڈرشپ (leadership) کا رول لے لیا ہے۔ بات یہ تھی کہ اُن کو تنظیم کا صدر منتخب کیا گیا تھا، مگر ٹرم پورا ہونے سے پہلے انھوں نے صدارت کے عہدے سے استعفا دے دیا۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ دوسرے حضرات ان کا تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

مذکورہ مسلمان اپنے اوصاف کے اعتبار سے، نہایت لائق انسان تھے۔ وہ تنظیم کو ترقی دینے کے لیے بہت کچھ کر سکتے تھے، مگر کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی زیادہ لائق ہو، وہ تنہا کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ بڑا کام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بہت سے لوگ اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ بقیہ لوگوں کے لیے ساتھ دینا صرف اُس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے راضی ہوں۔

اجتماعی زندگی کا اصول یہ ہے کہ ایک شخص لیڈرشپ کا رول صرف اُس وقت کامیابی کے ساتھ انجام دیتا ہے، جب کہ دوسرے لوگ شعوری طور پر اس بات پر راضی ہو جائیں کہ اُن کو سپورٹیو رول (supportive role) ادا کرنا ہے، نہ کہ لیڈرشپ (leadership) کا رول۔ سپورٹیو رول پر راضی ہونا بلاشبہہ ایک عظیم قربانی ہے۔ کوئی بڑا کام صرف اُس وقت انجام پاتا ہے، جب کہ ایک شخص کو لیڈر بنا کر بقیہ تمام لوگ سپورٹیو رول ادا کرنے پر راضی ہو جائیں۔ یہی سب سے بڑی قربانی ہے، اور اِس قربانی کے بغیر کسی بڑے کام کا انجام پانا ممکن نہیں۔

الرسالہ مشن

الرسالہ مشن 1976 میں ماہ نامہ الرسالہ کے اجرا سے شروع ہوا۔ الرسالہ مشن ایک پرامن دعوتی مشن ہے۔ اِس کی سرگرمیاں انٹرنیشنل سطح پر جاری ہیں۔ مگر الرسالہ مشن میں برانچ (branch) کا طریقہ نہیں۔ الرسالہ مشن میں انڈپنڈنٹ چیپٹر (independent chapter) کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ یہی طریقہ پیغمبرانہ سنت کے مطابق ہے۔

برانچ کے پیٹرن (pattern) میں ایسا ہوتا ہے کہ مشن دھیرے دھیرے ایک رٹین (routine) کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ لوگ ایک ہی مقرر طریقہ (prescribed method) کو بار بار دہراتے رہتے ہیں۔ اِس طرح بظاہر لوگ متحرک نظر آتے ہیں، لیکن یہ ایک بے روح حرکت ہوتی ہے۔ اِس حرکت میں کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ اِس حرکت میں کوئی تخلیقیت (creativity) نہیں ہوتی۔ اِس طریقے میں آدمی کے پاس بظاہر دوسروں کو دینے کے لیے کچھ ہوتا ہے، لیکن خود اپنے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اِس کے برعکس، انڈپنڈنٹ چیپٹر کا پیٹرن لوگوں کو مسلسل طور پر زندہ رکھتا ہے۔ آدمی کے ذہن میں تخلیقی عمل (creative process) جاری رہتا ہے۔ اِس طریقے میں ہر آدمی پروگرام ساز (program-maker) بن جاتا ہے۔ برانچ کا طریقہ اگر ذہنی جمود (intellectual stagnation) پیدا کرنے والا ہے تو انڈپنڈنٹ چیپٹر کا طریقہ ذہنی ارتقا (intellectual development) کا ذریعہ ہے۔

برانچ کے طریقے میں کام کو اَعداد وشمار کے اعتبار سے جانچا جاتا ہے۔ اِس کے برعکس، انڈپنڈنٹ چیپٹر کی صورت میں کام کو حقیقی نتیجے کے اعتبار سے دیکھا جاتا ہے۔ کسی مشن کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ افراد کے اندر زندہ شخصیت پیدا کرے، اور انڈپنڈنٹ چیپٹر کے طریقے میں یہ فائدہ پوری طرح حاصل ہوتا ہے۔ زندہ شخصیت صرف تخلیقی عمل کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے، زندہ شخصیت کبھی رٹین کے ذریعے پیدا نہیں ہوتی۔

سوال وجواب

سوال

حسب ذیل سوالات کی وضاحت مطلوب ہے۔ (ایک قاری الرسالہ، پاکستان)

آپ نے اپنے امریکا کے سفر (الرسالہ، جنوری 2012) میں یہ بات لکھی ہے کہ قرآن مجید واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ مگر امریکا کی معیشت جو سر تا سر سود پر استوار ہے، اس کی ترقی کو دیکھ کر آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قرآن کی سود کو گھٹانے اور صدقات کو بڑھانے والی بات جدید ذہن کے لیے قابل فہم نہیں۔ اس کے بعد آپ ان الفاظ سے مراد یہ لیتے ہیں کہ یہاں قرآن جس برکت کا ذکر کر رہا ہے، وہ ذہنی اور اسپریچول ترقی ہے (صفحہ: 26-25)۔ مگر ظاہر ہے کہ اس آیت میں کوئی ایسا لفظ نہیں پایا جاتا ہے جس سے یہ مفہوم نکالا جائے۔ آیت کا سیاق واضح طور پر بتا رہا ہے کہ سود کو گھٹانے اور صدقات کو بڑھانے کا تعلق آخرت سے ہے، نہ کہ دنیا سے۔

آپ ضعیف احادیث سے بکثرت استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو: ماہ نامہ الرسالہ، جولائی 2011، صفحہ 37 پر مذکور روایت (إن الدنیا خلقت لکم، و أنتم خلقتم للآخرۃ)۔

دوسری چیز جو میں قابل اصلاح سمجھتا ہوں، وہ مسلم لیڈر شپ کا نام لے کر براہ راست تنقید ہے۔ آپ کی تنقید سو فی صد درست ہے۔ میرا کہنا یہ نہیں ہے کہ آپ کسی کی ذات یا نیت پر تنقید کرتے ہیں۔ بس میری ناقص رائے میں تنقید رویوں پر ہونی چاہیے، شخصیات پر نہیں۔

اگلی چیز جو قابل اصلاح ہے، وہ آپ کا اپنے بارے میں خبر نامہ وسفر نامہ میں دوسروں کی رائے کا نقل کرنا ہے۔ اللہ نے آپ کو جو مقام ومرتبہ دیا ہے، وہ کافی ہے۔ اِس کے بعد عاجز انسانوں کی اپنے بارے میں رائے نقل کرنا آپ کی سطح کی معرفت رکھنے والے شخص کے لیے شاید مناسب نہیں۔

جواب

1۔ آخرت کا معاملہ کوئی علاحدہ معاملہ نہیں ہے، وہ پوری طرح موجودہ دنیا سے جڑا ہوا ہے۔ قرآن وحدیث میں جس چیز کو تزکیہ کہا گیا ہے، اُس کے لیے میں نے ذہنی اور روحانی ارتقا کا لفظ

استعمال کیا ہے۔ یہ تزکیہ یا ذہنی اور روحانی ارتقا ہی وہ چیز ہے جو آخرت میں اجر کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ جو لوگ حصولِ دنیا میں اتنا زیادہ گم ہوں کہ وہ اپنا تزکیہ نہ کرسکیں، وہ گویا 'محق' کا کیس بن رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو آخرت کے اجر سے محروم ہو کر رہ جائیں گے۔ واضح رہے کہ مذکورہ آیت کا یہ صرف ایک توسیعی پہلو ہے، وہ آیت کی مکمل تفسیر نہیں۔

2۔ ضعیف روایات کے بارے میں راقم الحروف کا مسلک وہی ہے جو عام طور پر علما کا مسلک ہے، یعنی ضعیف روایت کو اُس وقت قبول نہ کرنا جب کہ اس کا تعلق کسی حکمِ شرعی سے ہو، لیکن جب اس کا تعلق معرفت جیسے پہلو سے ہو تو اُس وقت ضعیف روایت کو قبول کرلیا جائے گا، بشرطیکہ وہ روایت قرآن وحدیث کی کسی معلوم نص سے ٹکراتی نہ ہو۔

حکمِ شرعی اور رمزِ معرفت کے درمیان نوعی فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص اگر یہ روایت بیان کرے کہ جو آدمی جھوٹ بولے، اس کی زبان کاٹ دو، تو اِس روایت کی صحت کو نہایت شدت سے جانچا جائے گا، کیوں کہ اس کا تعلق ایک حکمِ شرعی سے ہے۔ اِس کے برعکس، ایسی روایت جس کا تعلق حکمِ شرعی سے نہ ہو، بلکہ رموزِ معرفت سے ہو تو اس کو اِس شرط کے ساتھ دعوت وتربیت کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی معلوم نص سے نہ ٹکراتی ہو۔ اِسی معاملے کی ایک مثال الرسالہ میں مذکور یہ روایت ہے: إن الدنیا خلقت لکم، و أنتم خلقتم للآخرۃ۔ یہ روایت سند کے لحاظ سے اگرچہ ضعیف ہے، لیکن اس میں جو بات کہی گئی ہے، وہ تربیتی نقطۂ نظر سے، ایک درست بات ہے۔ کیوں کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ اِس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے بطور امتحان گاہ پیدا کیا ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اِس دنیا کو اصل نہ سمجھ لے، بلکہ یہاں کے حالات میں وہ فلاحِ آخرت کی تیاری کرے۔

3۔ نظریہ کے حوالے سے تنقید کرنا اور شخصیت کا حوالہ نہ دینا بذاتِ خود ایک درست اسلوب ہے اور الرسالہ میں اس اسلوب کی مثالیں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن بعض حالات میں ضروری ہوجاتا ہے کہ شخصیت کا نام لے کر اس کے نظریے پر تنقید کی جائے، ورنہ تنقید کا مطلوب فائدہ حاصل نہ ہوگا، خاص طور پر اُس وقت جب کہ کسی آدمی کے ساتھ شخصیت پرستی کا پہلو شامل ہوگیا ہو۔ ایسی حالت میں شخصیت کا نام لے کر

اس کے نظریہ پر علمی تنقید کرنا میرے نزدیک فرض کے درجے میں ضروری ہوجاتا ہے۔ البتہ تنقیص یا عیب زنی کا طریقہ کسی حال میں جائز نہ ہوگا، مدلل علمی تنقید کی شرط ہر حال میں لازمی طور پر باقی رہے گی۔

4۔ جس چیز کو آپ نے تعریف یا خود ستائی کے طور پر لیا ہے، اُس کا ذکر الرسالہ میں ''خبر نامہ'' کے تحت بطور تعریف نہیں ہوتا، بلکہ بطور تاریخ ہوتا ہے۔ کچھ چیزوں کی حیثیت ایک دعوتی مشن کے تاریخی ریکارڈ کی ہوتی ہے۔ اُن کو اگر ضبطِ تحریر میں نہ لایا جائے تو وہ ہمیشہ کے لیے لامعلوم ہوجائیں گی، اِس لیے ضروری ہے کہ ان کو تحریری شکل میں محفوظ کردیا جائے۔ مشن سے متعلق لوگوں کے تاثرات وغیرہ، الرسالہ میں تاریخی ریکارڈ کے اِسی اصول کے تحت درج کیے جاتے ہیں، اس کی حیثیت ایک مشن کے تاریخی ریکارڈ کی ہے، نہ کہ معروف معنوں میں شخصی تعریف کی۔

دوسری بات یہ کہ تعریف برائے تعریف بلاشبہہ ہرگز اچھی چیز نہیں ہے، لیکن ایک ایسی چیز جو بظاہر ''تعریف'' معلوم ہوتی ہو، لیکن اس کے اندر سبق کا کوئی پہلو پایا جاتا ہو تو اس کا ذکر ضرور کیا جائے گا، تاکہ عام لوگ اُس سبق سے محروم نہ رہیں۔ رسول اور اصحابِ رسول اور دیگر اہلِ علم کی زندگی میں اِس کی بہت سی مثالیں ''تحدیثِ نعمت'' کے عنوان کے تحت پائی جاتی ہیں۔

جہاں تک سفرنامے کا تعلق ہے، اِس میں اِس طرح کی باتیں اگر آتی ہیں تو وہ سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات کا بیان ہوتا ہے، اور سفرنامے میں بہر حال وہی باتیں کہی جائیں گی جو سفر کے دوران پیش آئی ہیں، نہ کہ مفروضہ طور پر وہ باتیں جو سفر کے دوران سرے سے پیش ہی نہیں آئیں۔ علمی اور تاریخی ذوق نہ ہونے کی بنا پر لوگ، عام طور پر، اس طرح کی چیزوں کو شخصی تعریف سمجھ لیتے ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سفرنامے میں اِس نوعیت کی چیزوں کا ذکر بیانِ واقعہ کے طور پر ہوتا ہے، نہ کہ کسی آدمی کی شخصی تعریف کے طور پر۔ اِس طرح کے معاملات میں صحیح رائے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر وہ چیز پائی جاتی ہو جس کو ڈیٹچڈ تھنکنگ (detached thinking) کہا جاتا ہے، یعنی اصل بات اور شخصیت کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھنا۔ علمی ذوق کا تقاضا ہے کہ چیزوں کو ہمیشہ ان کی میرٹ (merit) کی بنیاد پر دیکھا جائے، نہ یہ کہ وہ کسی کی تعریف ہے یا تنقیص۔

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔ الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

1- الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن 33 فی صد ہے۔ 50 پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن 40 فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ 2- زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ 3- کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تین مہینے تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرتعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے (ہوائی ڈاک)
ایک سال	Rs. 150	$20
دو سال	Rs. 300	$40
تین سال	Rs. 450	$60

Rahnuma-e-Zindagi
by
Maulana Wahiduddin Khan
ETV Urdu
Tuesday and Thursday 5.00 am

ISLAM FOR KIDS
by
Saniyasnain Khan/Maria Khan
ETV Urdu
Every Sunday 9.00 am

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2012-14
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2012-14

Bringing you a splendid range of Islamic books and children's products

The Quran, a book which brings glad tidings to mankind along with divine admonition, stresses the importance of man's discovery of truth on both spiritual and intellectual planes.

Peace, always desirable for its own sake, has been vital to human progress in every age. The difference now in this nuclear age is that it has literally become a matter of life and death for humanity.

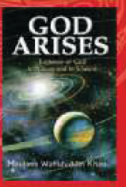

This book, the result of 30 years spent by the author in exhaustive research, attempts to present the basic teachings of religion in the light of modern knowledge and in a manner consistent with modern scientific method.

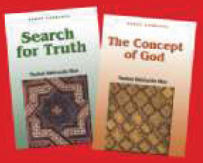

In this series, Maulana Wahiduddin Khan has presented the fundamental teachings of Islam in a simple way.

Harun Yahya's books have been instrumental in helping many to return to their faith in Allah, and, for many others, a deeper insight into their faith.

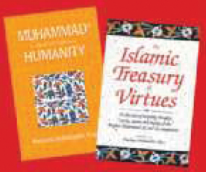

A collection of biographies, and traditions regarding the words and deeds of Prophet Muhammad.

New Releases...

Goodword
www.goodwordbooks.com

AL-RISALA (URDU) MONTHLY
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi - 110 013